معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۲۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

سندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف =/1,000 میں دستیاب ہے

نوٹ: (اوپر کی رقوم ہندوستانی روپے میں دی گئی ہیں۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷۱ے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۸۱ ماہ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۸ء عدد ۴

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

آثار علمیہ و تاریخیہ

ای میل: email : shibli_academy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.shibliacademy.org

شذرات

جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی اچانک رحلت سے دارالمصنفین آج بھی غم کدہ ہے، بام و در سراپا نالہ خاموش ہیں، صرف اضطراب دل ہے جو یاں کی ہست و بود کا سامان ہے، صبر و رضا کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات حی و قیوم ہی واحد سہارا ہے، یہ تاثر عمومی اور شدید ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی بہت دشوار ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کائنات کے حالات تکوینی خوش گوار ہوں یا ناخوش گوار، انسان کی قدرت و اختیار میں نہیں، نئے حالات میں رویہ اور عمل و کردار بہر حال عقل و شریعت کا پابند ہے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے سامنے آیندہ کے طریقہ کار اور لائحہ عمل کی فکر تھی، مولانا مرحوم کے انتقال اور تجہیز و تکفین کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اور مرحلہ یہی تھا کہ ادارے کے دستوری اور قانونی ضابطوں کو جلد سے جلد پورا کیا جائے، جوائنٹ سکریٹری جناب عبدالمنان ہلالی اگرچہ اپنے دیرینہ رفیق کے فراق سے محزون اور سراپا درد تھے لیکن فرض کی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے اراکین مجلس انتظامیہ سے مشورے کے لیے ۱۶؍ فروری کی تاریخ، ہنگامی جلسے کے لیے طے کردی۔

۱۶؍ فروری کے اس اہم جلسے میں تمام اراکین کی شرکت متوقع تھی لیکن مولانا معصومی (کلکتہ)، جناب سید حامد (دہلی)، مولانا سید محمد رابع ندوی (لکھنؤ)، مولانا تقی الدین ندوی (ابوظہبی)، پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی (علی گڑھ)، مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال)، ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں (دہلی)، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (علی گڑھ) جلسے میں شرکت نہ کرسکے، کچھ خرابی صحت سے معذور تھے اور باقی کے ساتھ دوسرے موانع تھے، جن ارکان نے جلسے میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، ڈاکٹر عبداللہ (مقیم امریکا)، پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی (علی گڑھ)، جناب مرزا امتیاز بیگ (حال مقیم علی گڑھ)، ڈاکٹر سلمان سلطان (اعظم گڈھ) اور عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری)، پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی نے اس اہم جلسے کے موقع پر ایک خط بھی تحریر فرمایا تھا۔

مجلس انتظامیہ نے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے شروانی صاحب کے اس خط کو بھی

سامنے رکھا اور بالآخر متفقہ طور پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کو دارالمصنفین کا سکریٹری منتخب کرلیا، پروفیسر موصوف سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی گزارش کی گئی، وہ اس وقت ملک سے باہر تھے، پیہم اصرار کے بعد انہوں نے اس بار گراں کو سنبھالنے پر آمادگی ظاہر کردی اور اس طرح مولانا سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمان اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی رحمہم اللہ کی زریں روایت کا وہ بھی ایک حصہ بن گئے، علمی و تحقیقی رتبہ بلند ان کو پہلے ہی حاصل ہے، وہ مدرسۃ الاصلاح سے اکتساب فیض کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طالب علم رہے اور بعد میں اسی یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ کے معلم ہوئے اور نیک نامی سے پروفیسر ہو کر سبک دوش ہوئے، علی گڑھ سے شائع ہونے والے ششماہی مجلّہ ”علوم القرآن“ کے مدیر بھی ہیں، دارالمصنفین سے اخلاص اور قربت کا تعلق برابر رہا، برسوں سے وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں اور اس کی اصلاح و فلاح کے لیے مخلصانہ مشورے دیتے رہے ہیں، ان کے انتخاب سے توقع ہے کہ ان کے علم اور تجربے سے ادارے کو انشاء اللہ فائدہ ہوگا اور معارف کے معیار اور وقار کی ضمانت بھی ان کے دم سے ہوگی، اس نیاز مند کو ان کی معاونت کا شرف بخشا گیا ہے، صلاحیت و لیاقت کے فقدان کی وجہ سے میرے لیے یہ حکم در اصل امتحان ہے، کامیابی کے لیے نظر صرف خدائے تعالیٰ کی ذات پر ہے، وعلیہ التکلان، دعا یہی ہونی چاہیے اور ہے کہ اللہ تعالیٰ دین و ملت و قوم کے ورثہ اور اسلاف کرام کی اس امانت کی حفاظت فرمائے اور اراکین مجلس انتظامیہ کے فیصلوں کو نافع اور بابرکت بنائے۔

قریب ایک صدی قبل دارالمصنفین کے تخیل میں صرف ایک جذبہ پنہاں تھا کہ یہ ادارہ اسلام کی خدمت کے لیے خاص ہو، جہاں اسلامی علوم کو جدید علم کلام کے رنگ میں پیش کرکے، اسلامی تہذیب و تمدن کی تشریح اور تبلیغ، دور جدید کے اسلوب میں کی جائے، اسلام کے افکار و اقدار کی معنویت، مثبت انداز میں واضح کی جائے اور یہ اس طرح کہ اس کے اہل قلم، ہزاروں دلوں پر اسلام کی ترجمانی سے حکم رانی کرسکیں، علامہ شبلی کے اس تخیل اور خواب کی تعبیر، دارالمصنفین کی اب تک کی تاریخ ہے جس کا سب سے شفاف اور روشن آئینہ رسالہ ”معارف“ ہے جس کے ذریعہ دارالمصنفین کے امتیازات و خصائص کا اثر اردو اور شاید عالم اسلام کے ادب پر پڑا، مذہب و فلسفہ، عقل و نقل،

جدت وقدامت، منطقیت، ادبیت، تحقیق ولطافت کی یک جائی سے معارف نے دار المصنفین کے مزاج اعتدال کا ایک قابل تقلید نمونہ پیش کردیا اور یہی وجہ ہے کہ اہل نظر نے معارف کو اردو ہی نہیں دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ قرار دیا، بہ طور تحدیث نعمت اس رتبے کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ اس مقام کے حصول میں معارف کے اہل علم و دانش مقالہ نگار حضرات کی معاونت کا اعتراف ہو، جنہوں نے اس کے معیار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اس کو کبھی متاثر نہیں ہونے دیا، اس تعاون کی بنیاد اصلاً علوم اسلامیہ کی خدمت ہے کہ معارف محض ایک رسالہ ہی نہیں ملک وملت کے خادموں کا مقدمۃ الجیش بھی ہے، اس کی آبیاری میں کئی نسلوں کا خون جگر شامل ہے، توقع بلکہ یقین کامل ہے کہ بزم علم و تحقیق کی یہ شمع ہمیشہ فروزاں رہے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ خبر افسوس ناک ہے کہ اردو کے ایک اور خدمت گزار پروفیسر افغان اللہ خاں صاحب نے بھی اچانک آخرت کا رخت سفر باندھ لیا، ایک سمینار میں شرکت کے لیے انہوں نے دہلی کا سفر کیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ یہ اس دنیا کے آخری سفر کی تیاری تھی، سمینار کے پہلے روز وہ پورے نشاط کے ساتھ مختلف نشستوں میں شریک رہے، دوسرے روز دل میں درد اٹھا جس نے دنیا کے ہر دکھ سے ان کو نجات دے دی، وہ گورکھ پور یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے، سکونت بھی اسی شہر میں تھی لیکن رہنے والے اصلاً وہ اعظم گڈہ کے ایک گاؤں خالص پور کے تھے، شروع سے ذہین تھے، فراق گورکھ پوری پر جناب محمود الٰہی کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور اس شان سے کہ موضوع پر یہ مقالہ خود سند بن گیا، کئی کتابیں سپرد قلم کیں، تاریخ ہند سے متعلق طراز ظہیری ان کی آخری تالیف تھی، باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے، دار المصنفین سے رشتہ اخلاص تھا، آخری بار وہ علامہ شبلی سمینار میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے تھے، اتفاق ہے کہ مارچ کے معارف میں ان کا مضمون شائع ہوا، وہ ایک ہمدرد استاد، ہمدرد دوست اور ہمدرد انسان تھے، یوپی اردو اکیڈمی بھی ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھی، گوشہ نشین اردو کے خادموں کی خدمت انہوں نے بے غرض ہو کر کی، صرف ۵۷ سال کی عمر میں ان کا اس طرح رخصت ہو جانا اردو کے لیے ہی نہیں، انسانیت اور شرافت کی دنیا کے لیے ایک بڑا حادثہ اور خسارہ ہے، خدا مغفرت فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

مقالات

کیا گرنتھ صاحب میں فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا کلام شامل ہے؟

از:- فیروز الدین احمد فریدی☆

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (باباصاحبؒ) سے منسوب قدیم ملتانی بولی کے اشعار کا مجموعہ اور اس کے اردو اور انگریزی کئی تراجم برصغیر پاک وہند میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے، پہلا انگریزی ترجمہ، جو ایک انگریز نے کیا تھا، ۱۹۰۹ء میں ہندوستان سے شائع ہوا، بعد میں انگریزی تراجم امریکا سے بھی شائع ہوئے، اردو تراجم میں منظوم ترجمے بھی ہیں، باباصاحبؒ کا وصال ۱۳/یا ۱۴/اگست ۱۲۷۱ء (۵/محرم ۶۷۰ھ) کو ہوا، اسی طرح ۲۰۰۸ء/۱۴۲۹ھ میں، انہیں ہم سے جدا ہوئے عیسوی تقویم کے مطابق ۷۳۷ برس اور ہجری تقویم کے مطابق ۷۵۹ سال بیت چکے ہیں، اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کلام کی مسلسل اشاعت اور ہر بار زیادہ دیدہ زیب اڈیشنوں میں طباعت، باباصاحبؒ سے مسلمانوں اور خصوصاً سکھوں کی عقیدت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، یہ عقیدت اس کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ماوراان اسباب کی بنا پر ہے، جو مسبب الاسباب اور اس کے چنے ہوئے بندوں کے درمیان راز ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا قدیم ملتانی بولی کے یہ اشعار فی الواقع باباصاحبؒ کے ہیں؟ باباصاحبؒ کی سخن سنجی اور سخن فہمی میں کوئی کلام نہیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ صاحب کلام شاعر بھی تھے، اللہ کے یہ دوست جو زندگی بھر حق کے دیوانے اور سچ کے متلاشی رہے، کبھی یہ نہیں چاہیں

☆ کھنوال ہاؤس، باتھ آئی لینڈ، کراچی، پاکستان ۷۵۵۶۰۔

گے کہ کوئی بات ، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو ، ان سے منسوب کی جائے جو ان سے حقیقتاً
نسبت نہ رکھتی ہو۔

یہاں ایک آنکھوں دیکھے واقعے کا ذکر برمحل ہوگا ، باباصاحبؒ کی سب سے مشہور (گو
سوفی صد مستند نہیں) سوانح علی گڑھ یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے انگریزی
زبان میں لکھی ہے ، یہ پہلی بار ۱۹۵۵ء اور آخری بار ۱۹۹۸ء میں بھارت سے شائع ہوئی اور اس
عرصے کے دوران بھی اس کا اڈیشن نکلا ، ان سب اڈیشنوں میں جن کا عرصۂ اشاعت ۴۳ برس
پر محیط ہے ، پروفیسر نظامی نے ساڑھے چھ سو سالہ قدیم اور مشہور قلمی نسخے '' سیر الاولیا '' کے حوالے
سے مندرجہ ذیل شعر باباصاحبؒ سے منسوب کیا ہے۔

خورش دہ بکنجشک و کبک و ہمام کہ ناگہ ہمائی در افتد بدام

ترجمہ : چڑیا ، چکور اور کبوتر کو دانہ ڈال تا کہ (کسی روز) اچانک ہُما تیرے جال میں آجائے۔

سیر الاولیا کے دو قدیم قلمی نسخوں میں جن میں سے ایک برٹش لائبریری لندن میں ہے
اور اورنگ زیب عالم گیر کے عہد (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) میں کتابت ہوا اور دوسرا جس کا سنہ
کتابت درج نہیں ، قومی عجائب گھر کراچی میں ہے ، یہ شعر لندن کے مخطوطے کے ورق نمبر ۴۰، اور
کراچی کے مخطوطے کے (مفروضہ) صفحہ نمبر ۹۵ پر ان ہی الفاظ میں لکھا ہوا ہے ، علاوہ ازیں
برصغیر پاک و ہند میں حوالے کے طور پر استعمال ہونے والے سیر الاولیا کے چرنجی لال اڈیشن
(مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء) کے صفحہ نمبر ۸۷ پر بھی شعر کا اندراج ان ہی الفاظ میں ہے۔

ان تینوں نسخوں میں شعر سے پہلے یہ مختصر فقرہ لکھا ہے : '' شیخ شیوخ العالم نے فرمایا ''
اور فوراً بعد یہ شعر ہے ، ۲۰۰۶ء میں جب اردو کے معروف ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی باباصاحبؒ کے
ملفوظات پر مشتمل اپنے مقبول کتابچے کے چوتھے اڈیشن پر نظر ثانی کر کے اسے طباعت کے لیے
بھجوا رہے تھے تو راقم نے پروفیسر نظامی کی مندرجہ بالا مشہور سوانح میں باباصاحبؒ سے منسوب یہ
فارسی شعر دکھا کر ، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے کہا کہ ان کے کتابچے کے پچھلے تین اڈیشنوں میں
باباصاحبؒ کا یہ خوب صورت فرمودہ شامل ہونے سے رہ گیا ہے ، ڈاکٹر صاحب نے چند روز بعد
راقم حروف کو بوستان سعدی کے ایک پرانے مطبوعہ نسخے کے حاشیے پر شیخ سعدی کا اسی مضمون کا

شعر دکھایا جو انہوں نے عرق ریزی کے بعد ڈھونڈ نکالا تھا اور کہا کہ باباصاحبؒ نہیں چاہتے ہوں
گے کہ ان کے فرمودات پر مشتمل کتابچے میں کوئی ایسی بات ان سے منسوب ہو جو انہوں نے
نہیں کہی ہو۔

راقم حروف نے بعد میں بوستان سعدی کے دو مختلف مطبوعہ نسخے دیکھے جن میں اس
شعر کے الفاظ یہ ہیں۔

خورش دہ بدراج و کبک و حمام کہ یک روزت افتد ہمائی بدام

ترجمہ : تیتر ، چکور اور کبوتر کو دانہ ڈال تا کہ کسی روز ہُما تیرے جال میں آجائے۔

اس غیر متوقع دریافت سے چار باتیں معلوم ہوئیں ، اولاً جس حسین شعر کو باباصاحبؒ
کے سب سے مشہور سیرت نگار نے ، سیر الاولیا کی سند اور اپنے پرزور دلائل کے ساتھ اپنی کتاب میں
باباصاحبؒ سے منسوب کیا تھا ، وہ باباصاحبؒ کا نہیں تھا بلکہ باباصاحبؒ نے موقع کی مناسبت
سے اسے پڑھا تھا ، سیر الاولیا کے الفاظ میں انہوں نے '' فرمایا '' تھا جس سے پروفیسر نظامی
بوستان سعدی سے کما حقہ آشنائی نہ ہونے کے باعث یہ سمجھے کہ یہ شعر باباصاحبؒ نے کہا تھا جب
کہ انہوں نے '' کہا '' ، نہیں تھا بلکہ '' فرمایا '' تھا ، ثانیاً اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باباصاحبؒ جنہیں
لوگ ایک صوفی کی حیثیت سے جانتے ہیں ، شعر و سخن کا اتنا وسیع اور عمیق ذوق رکھتے تھے کہ نہ
صرف قدیم شاعری بلکہ اپنے ہم عصر شعرا کے کلام پر بھی دست رس رکھتے تھے۔

شیخ سعدی باباصاحبؒ کے ہم عصر تھے ، اس زمانے میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی
تھیں اور اونٹوں ، گھوڑوں اور خچروں کے ذریعے پہاڑ ، دریا ، جنگل اور صحرا پار کرتے ہوئے ایک
سے دوسرے ملک میں پہنچتی تھیں ، تیرہویں صدی عیسوی میں بوستان سعدی کا شیراز (جنوبی
ایران) سے پاک پتن پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا ، آسان کام تو یہ آج بھی نہیں ہے ، ثالثاً معلوم
ہوا کہ بڑھاپے میں بھی ، باباصاحبؒ کا حافظہ غضب کا تھا ، انسان ستر سال کا ہو جائے تو سترے
بہترے کی اصطلاح کا حق دار ہو جاتا ہے ، یہاں اسّی نوے سال میں یادداشت ایسی تھی کہ اپنے
ہم عصر شاعر کا حسب موقع شعر برجستہ پڑھ ڈالا ، رابعاً بوستان اور سیر الاولیا میں ایک ہی شعر کے
دونوں مصرعوں میں الفاظ کا فرق اسی جانی پہچانی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ کانوں سنی اور

آنکھوں دیکھی میں اکثر فرق ہو جاتا ہے، سیر الاولیا کے مولف امیر خورد کرمانی عالم تھے، شاعر تھے، بابا صاحبؒ کے عقیدت مند تھے اور عقیدت کا یہ پاکیزہ رشتہ ان کے باپ اور دادا تک پہنچتا تھا اور یہ تینوں اور ان کے اہل خاندان بابا صاحبؒ کے سب سے چہیتے خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے چاہنے والے بھی تھے، اگر امیر خورد جیسے عالم، شاعر اور عقیدت مند سے شعر کے الفاظ اپنے بڑوں کی زبان سے سننے، یا بعد میں انہیں نقل کرنے میں یہ معمولی سا سہو ہو سکتا ہے اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر نظامی جو ایک معروف مورخ، محقق، مصنف اور معلم بھی تھے، اس شعر کو نہ صرف سیر الاولیا کے حوالے سے بابا صاحبؒ سے منسوب کرتے ہیں بلکہ اس کے حق میں دلائل بھی دیتے ہیں جو ان کی کتاب میں پڑھے جا سکتے ہیں، تو مقام فکر ہے کہ کیا بابا صاحبؒ سے منسوب ایک نہیں بلکہ ایک سو سے زائد اشعار پر مشتمل ملتانی بولی کا وہ کلام جسے آج دنیا بابا صاحبؒ کا کلام سمجھ کر پڑھ رہی ہے، ان غلطیوں کا شکار نہیں ہو سکتا؟ اس ضمن میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر اکیسویں صدی عیسوی میں بابا صاحبؒ کے ایک چاہنے والے نے اپنی لگن پر مبنی جستجو سے معلوم کر لیا کہ یہ شعر بابا صاحبؒ کا نہیں بلکہ عقیدت پر مبنی غلط فہمی سے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے تو کیا اسی اکیسویں صدی عیسوی میں بابا صاحبؒ کے دوسرے چاہنے والے اپنی لگن پر مبنی جستجو سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ملتانی بولی کے جو ۱۱۲/اشعار بابا صاحبؒ کے بتائے جا رہے ہیں، وہ بھی صدیوں پہلے عقیدت پر مبنی کسی غلط فہمی سے بابا صاحبؒ سے منسوب تو نہیں ہو گئے؟ صدیوں بعد یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں، شرائط تین ہیں: اولاً نیت صاف ہو، ثانیاً ذہن کھلا ہو، ثالثاً بابا صاحبؒ کی خوشنودی اور اس کے ساتھ ان کی رہنمائی حاصل ہو۔

گرنتھ صاحب میں بابا صاحبؒ سے منسوب کلام کے بارے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس نسبت کی بنیاد کیا ہے؟ بابا صاحبؒ کے بارے میں مستند معلومات کی فطری اور مستحکم ترین بنیاد ان کے وہ مشہور معاصرین ہو سکتے ہیں جن کی شہرت بے داغ ہو، ان معاصرین میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ اولیت رکھتے ہیں، ان کی شخصیت کے عناصر ثلاثہ، علم، عشق اور عقل تھے اور اگر عناصر اربعہ کی بات کی جائے تو وہ علم، عشق، عقل اور عمل تھے، ہماری خوش بختی ہے کہ خواجہ صاحب کے انتہائی مستند ملفوظات کا مجموعہ "فوائد الفواد" کے نام سے آج بھی موجود ہے اور اس

کے اردو اور (قابل تصحیح) انگریزی تراجم بھی دست یاب ہیں، یہ ملفوظات جو تقریباً ساڑھے چودہ برس پر محیط ہیں، ان ۱۷۸ حقیقی معنوں میں روح پرور مجالس میں قلم بند کیے گئے جو ۲۸/جنوری ۱۳۰۸ء (بہ مطابق ۳/شعبان ۷۰۷ھ) سے ۳/ستمبر ۱۳۲۲ء (بہ مطابق ۲۰/شعبان ۷۲۲ھ)، خواجہ صاحبؒ کے اس دو منزلہ جماعت خانے میں جو نئی دہلی میں مغل شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کے پاس بتایا جاتا ہے، وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہیں، ان دل نشین ملفوظات میں بابا صاحبؒ کا ذکر جا بہ جا روشن تاروں کی طرح جگمگا رہا ہے لیکن ان میں کہیں یہ اشارہ تک نہیں کہ بابا صاحبؒ ملتانی بولی کے شاعر تھے، خواجہ صاحبؒ سماع کے عاشق تھے، یہ عشق اس درجے پر تھا کہ ان کی آرزو تھی کہ اپنے دادا پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی طرح وہ بھی سماعت کے دوران اپنے پیدا اور پرورش کرنے والے سے جا ملیں، اگر بابا صاحب کا عربی، فارسی یا ملتانی میں کلام ہوتا تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کلام خواجہ صاحبؒ کی محافل سماع میں نہ پڑھا جاتا اور اس بات کا ذکر فوائد الفواد کی ساڑھے چودہ سال پر محیط مجالس میں یا سیر الاولیا کے سیکڑوں صفحات پر محیط قلمی نسخے کے کسی صفحے پر نہ ہوتا، بابا صاحب کے کلام کو خواجہ صاحبؒ کے زمانے سے برصغیر میں شہرت ملتی اور اسے پورے ۳۳۳ برس تک گرنتھ صاحب کے ظہور کا طویل انتظار نہ کرنا پڑتا۔

صوفیہ اور علما کے مسالک میں سماع پر تو شدید اختلاف رہا ہے لیکن شعر گوئی پر کبھی کوئی قدغن نہیں رہی، شیخ فرید الدین عطارؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ اور امیر خسروؒ عظیم صوفیہ ہونے کے ساتھ عظیم شعرا تھے اور ان کا کلام انسانی تہذیب کا ورثہ ہے، اگر بابا صاحبؒ نے ملتانی بولی میں سیکڑوں اشعار کہے ہوتے، جن میں سے ۱۱۲/اشعار منتخب کر کے گرنتھ صاحب میں ۳۳۳ برس بعد شامل کیے گئے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان مقبول عام اشعار کو ان کے عاشق صادق خواجہ نظام الدین اولیاؒ، پورے ساڑھے چودہ برس کے دوران، نہ اپنی محافل سماع میں فرمائش کر کے سنتے اور نہ ان کا ذکر ان کے ملفوظات میں ہوتا، بابا صاحبؒ اور خواجہ صاحبؒ کے چاہنے والوں کے لیے یہ مقام فکر ہے۔

اس پس منظر میں جب یہ کہا جائے کہ بابا صاحبؒ پنجابی زبان (جس سے مراد قدیم ملتانی بولی ہے) کے پہلے مسلمہ شاعر تھے اور ثبوت میں صرف گرنتھ صاحب پیش کی جائے تو اہل نظر

پوچھیں گے کہ کہیں یہ نظر کا دھوکا تو نہیں ؟ یا کہیں صدیوں سے یہ نظر بندی تو نہیں ہوگئی ؟

بابا صاحبؒ کا وصال ۱۲۷۱ء میں ہوا اور گرنتھ صاحب کی تکمیل ۱۶۰۴ء میں ہوئی، اس کے ایک باب کا عنوان ہے:

"بانی سیکھ پھرید جیو" یعنی "شلوک شیخ فرید جی" اس عنوان کے تحت ۱۳۰/ شلوک درج ہیں، شلوک سنسکرت کا لفظ ہے جسے ہندی زبان میں "ا" کے اضافے کے ساتھ "اشلوک" کہتے ہیں، فی الحال اسے شعر کے مترادف سمجھیں، یہ عنوان باباصاحبؒ کو ملتانی بولی کا شاعر قرار دینے کی واحد بنیاد بنا ہے، دوسرے الفاظ میں اگر یہ عنوان نہ ہوتا تو آج جو کلام باباصاحبؒ کا کلام سمجھا جاتا ہے وہ باباصاحبؒ کا کلام نہ کہلاتا، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ عنوان کب کیسے اور کس نے قائم کیا اور اس عنوان کے تحت درج شدہ اشعار اپنے الفاظ کی زبان سے کیا حقیقت بیان کررہے ہیں؟ گرنتھ صاحب کا نام آئے گا تو ذکر گرونانک سے شروع ہوگا۔

گرونانک ۱۴۶۹ء میں پاکستانی پنجاب کے ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبے تلونڈہ میں پیدا ہوئے، یہ قصبہ اب شہر ہے اور نانک صاحب کے نام پر ننکانہ صاحب کہلاتا ہے، سکھ ہر اس چیز کے ساتھ جس کا تعلق ان کے کسی گرو سے ہو "صاحب" کا لاحقہ لگاتے ہیں، چنانچہ گرنتھ کو گرنتھ صاحب، امرت سر کے بڑے گردوارے کو دربار صاحب اور جس پتھر پر گرونانک کے پنجے کا مبینہ نقش حسن ابدال میں ہے، اسے پنجہ صاحب کہتے ہیں، حتیٰ کہ جس کوٹھری میں گرونانک کو کچھ دیر کے لیے بند رہنا پڑا تھا وہ "کوٹھری صاحب" کہلاتی ہے، گرونانک نے ۶۹ برس کی عمر میں ۱۵۳۸ء میں وفات پائی، وہ ایک عظیم موحد بزرگ تھے، قدسی مقال اقبالؔ نے ان کے بارے میں کہا ہے۔

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

گرونانک کو اللہ والوں اور ان کے کلام سے بہت لگاؤ تھا، راقم حروف نے بغداد میں شیخ جنید بغدادیؒ کے مزار کے باہر ایک چلّہ گاہ دیکھی ہے جو گرونانک کی چلّہ گاہ کہلاتی ہے، صوفیانہ کلام کی تلاش میں، گرونانک "عصا ہتھ کتاب کچھ" یعنی ہاتھ میں عصا اور زیر جامے میں بیاض لیے نگر نگر گھومتے رہے، گرنتھ صاحب میں برصغیر کی چھ بڑی اور کئی چھوٹی بولیوں پر مشتمل کلام موجود ہے، جس میں باباصاحبؒ کے علاوہ جن غیر سکھ حضرات کا کلام موجود ہے، ان میں

سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) سعدنا قصائی، (۲) روی داس چمار، (۳) کبیر جلاہا، (۴) بھیکھن مسلمان، (۵) سجھ دیو باہمن، (۶) ترلوچن ویش (۷) نام دیو چھینا بتایا جاتا ہے کہ اسی تلاش میں گرونانک پاک پتن بھی آئے جہاں اس وقت باباصاحبؒ کے بارھویں خلیفہ شیخ محمد ابراہیم کلاں سجادہ نشین تھے، وہ غالباً ۱۵۳۳ء میں سجادہ نشین بنے جب کہ گرونانک کا انتقال ۱۵۳۸ء میں ہوا، ۱۹۰۹ء میں میکس آرتھر میکالف نامی ایک انگریز افسر نے سرکاری ملازمت سے استعفادے کر چھ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام تھا "سکھوں کا مذہب، گروصاحبان، مقدس کتابیں اور مصنفین"، پہلی جلد میں گرونانک کے حالات زندگی درج ہیں جن کا ماخذ گرونانک کی قدیم سوانح ہائے حیات ہیں جنھیں گرونانک کے قریبی ساتھیوں نے لکھا ہے اور جو "جنم ساکھی" کہلاتی ہیں، پہلی جلد کے ساتویں باب میں گرونانک کی "شیخ برہم" کے ساتھ پاک پتن میں ہونے والی پہلی ملاقات اور نویں باب میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے، نویں باب میں بتایا گیا ہے کہ جب گرونانک نے پاک پتن کا قصد کیا تو وہ ننکانہ صاحب سے مغرب کی سمت روانہ ہوئے اور دریائے چناب پار کرکے پاک پتن پہنچے، پہلی بات یہ ہے کہ پاک پتن ننکانہ صاحب کے مشرق میں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ دریائے چناب ننکانہ صاحب کے مغرب میں ہے اور ننکانہ صاحب اور پاک پتن کے درمیان دریائے چناب نہیں آتا۔

جغرافیے کی ان بدیہی اغلاط کے علاوہ اس کتاب میں جو سکھوں کے ایما اور جنم ساکھیوں کی مذہبی کتابوں کی بنیاد پر لکھی گئی، سب سے چونکا دینے والی چیز گفتگو کا وہ انداز ہے، جس میں گرونانک اور شیخ برہم (ابراہیم) نے ایک دوسرے سے بات چیت کی، یہ گفتگو شروع سے آخر تک شعروشاعری میں ہوئی، گفتگو کا آغاز شیخ ابراہیم سے ہوتا ہے جنھوں نے گرونانک کو دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا، جواب میں گرونانک نے ایک رباعی پڑھی، بعد کے مکالمے اکثر جگہ غزلوں پر مشتمل ہیں، تاریخ میں شیخ ابراہیم (اور باباصاحبؒ) کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں ملتا، فرض کرلیں کہ شیخ ابراہیم شاعر تھے، تب بھی کیا یہ ممکن ہے کہ دو شاعر کئی روز تک صرف شعر کی زبان میں باتیں کرتے رہیں اور نثر کا کوئی فقرہ ان کی زبان سے نہ نکلے، اس منظوم مکالمے میں چار شلوک یعنی نمبر ۱۵۴

۱۰۳/۱۱۲/اور ۱۲۶ جو شیخ ابراہیم کی گفتگو کا حصہ ظاہر کیے گئے ہیں وہ ان ۱۱۲/ شلوک کا بھی حصہ ہیں جو بعد میں بابا صاحبؒ سے منسوب کر کے آج گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔

زمانۂ قدیم سے یہ چلن چلا آرہا ہے کہ عقیدت مند خوش عقیدگی سے اور مادیت پرست اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر عظیم مذہبی رہنماؤں سے ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جو ان کی نہیں ہوتیں، اس کی سب سے بڑی مثال وہ لاکھوں حدیثیں ہیں جو رسول کریمؐ کی وفات کے بعد اگلے دو سو سال کے دوران ان سے غلط منسوب کر دی گئیں اور عوام میں رائج ہو گئیں، اگر قدرت امام بخاریؒ (۱۹۶ھ تا ۲۵۶ھ بہ مطابق ۸۰۹ء تا ۸۷۰ء) کو اس خصوصی فریضے پر دنیا میں نہ بھیجتی کہ وہ ان لکھو کھا غلط حدیثوں کو غلط ثابت کر کے صحیح حدیثوں کا مجموعہ مرتب کریں تو یہ غلط حدیثیں گیارہ صدی بعد آج بھی احترام سے پڑھی جارہی ہوتیں، روایت ہے کہ امام بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ وہ رسول کریمؐ کے حضور میں کھڑے ہیں اور ہاتھ میں پنکھا لیے آپؐ پر سے مکھیاں اڑا رہے ہیں، تعبیر یہ بتائی گئی (اور نکلی) کہ وہ جعلی حدیثیں رد کر کے مکھیوں کی طرح اڑا دیں گے، امام صاحبؒ نے ''الجامع الصحیح'' یعنی صحیح بخاری مرتب کی جسے ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب کا لقب دیا گیا۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ ابھی زندہ تھے کہ ان کے نام سے ایک جعلی کتاب اودھ (جو اتر پردیش بھارت کا حصہ ہے) میں گردش کر رہی تھی اور خواجہ صاحبؒ نے اپنی ۵ محرم ۷۱۰ھ کی مجلس میں اس کی تردید کی تھی، سلسلۂ چشتیہ کے عظیم صوفیہ کے ملفوظات کے کئی جعلی مجموعے، ان کے وصال کے بعد شائع کیے گئے، اگر خواجہ صاحبؒ کی زندگی میں ان سے ایک جعلی تصنیف منسوب کی جاسکتی ہے اور رسول کریمؐ کے وصال کے دو سو سال کے دوران ان سے لاکھوں جھوٹی حدیثیں منسوب ہو سکتیں ہیں تو کیا بابا صاحبؒ کے وصال کے تین سو برس بعد ان سے سو اشعار غلط طور پر منسوب نہیں ہو سکتے؟ یہاں صرف سوال کیا جارہا ہے، اس کے جواب میں جو ناقابل تردید خارجی شواہد اور ٹھوس داخلی شہادتیں موجود ہیں، وہ بعد میں پیش کی جائیں گی۔

گرونانک نے اپنی جہاں گردی کے دوران جو کلام جمع کیا تھا، وہ ان کے جانشین اور دوسرے گرو انگد (۱۵۰۴ء تا ۱۵۵۲ء) کو ملا، گرونانک کا انتقال ۱۵۳۸ء (خاندان سوری کے

عہد) میں ہوا تھا، اس طرح یہ مجموعہ کلام اگلے ۱۴ برس (۱۵۳۸ء تا ۱۵۵۲ء) دوسرے گرو کے پاس رہا لیکن یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے اس پر کیا کام کیا، دوسرے گرو کے انتقال پر یہ مجموعہ کلام تیسرے گرو امرداس (۱۴۷۹ء تا ۱۵۷۴ء) کی تحویل میں آیا اور مرتب کرنے کے کام کا آغاز ہوا، تیسرے گرو نے ۹۵ برس کی لمبی عمر پائی اور وہ ۲۲ برس گرو کے منصب پر رہے، انہوں نے اپنے پوتے کی نگرانی میں یہ کلام دو جلدوں میں مدون کیا، پہلی جلد ۳۰۰/ اور دوسری جلد ۲۲۴/ اوراق پر مشتمل تھی جن میں سے کسی میں بابا صاحبؒ سے منسوب یہ شلوک درج نہ تھے۔

چوتھے گرو رام داس (۱۵۳۴ء تا ۱۵۸۱ء) تیسرے گرو کے داماد تھے، ان کے سات سالہ دور (۱۵۷۴ء تا ۱۵۸۱ء) میں ان کے شاعر بڑے بیٹے نے اپنے باپ سے خفا ہو کر نانک کے تخلص سے شاعری شروع کر دی اور ان کا کلام اتنا مقبول ہوا کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ کلام گرونانک کے کلام کے طور پر مشہور ہو کر کسی وقت گرنتھ صاحب کا حصہ نہ بن جائے۔

یہ تھا وہ چیلنج جس سے نمٹنے کے لیے چوتھے گرو کے ۱۸ سالہ بیٹے اور پانچویں گرو ارجن دیو (۱۵۶۳ء تا ۱۶۰۶ء) نے گرنتھ صاحب کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھنے کی غرض سے، اس کی از سر نو تدوین کا بیڑا اٹھایا، گرو ارجن شاعری کا خداداد ملکہ رکھتے تھے، وہ ۲۵ سال ۱۵۸۱ء تا ۱۶۰۶ء) گرو رہے اور اپنے انتقال سے دو برس پہلے ۱۶۰۴ء میں یہ کام مکمل کر لیا، اس طرح بابا صاحبؒ سے منسوب یہ اشعار جو ۲۳ برس پہلے یعنی ۱۵۸۱ء تک گرنتھ صاحب میں نہیں تھے، پہلی بار ''شلوک شیخ فرید جی'' کے عنوان کے تحت ۱۶۰۴ء میں گرنتھ صاحب میں نظر آئے، اس عنوان کے تحت ۱۳۰/ شلوک تھے اور ہیں۔

سوال یہ ہے کہ گرو ارجن دیو نے کس بنیاد پر ''شلوک شیخ فرید جی'' کا عنوان قائم کیا؟ جواب سکھ مت کے علما ہی دے سکتے ہیں، اگر جواب میں ''گرو ساکھیاں'' پیش کی جائیں تو اس سے قطع نظر کہ یہ سوانح عمریاں کتنی مستند یا غیر مستند ہیں، یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سوانح عمریاں تو ۱۵۷۴ء میں بھی موجود تھیں جب تیسرے گرو کے ۲۲ سالہ سالہ دور میں گرنتھ صاحب کی دو جلدیں مرتب ہوئیں، اس وقت یہ اشعار گرنتھ صاحب میں کیوں شامل نہیں کیے گئے؟ اس کا جواب بھی سکھ علما ہی دے سکتے ہیں۔

۱۶۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک یہ شلوک باباصاحبؒ کے سمجھے جاتے رہے، ۱۹۰۹ء میں جب میکالف کی کتاب منظر عام پر آئی تو اس میں یہ فقرہ تھا: ''اب یہ بات یقینی ہے کہ شیخ برہم (شیخ ابراہیم) نے وہ شلوک اور شبد تصنیف کیے ہیں جو گرنتھ صاحب میں فرید کے نام سے درج ہیں، اگرچہ انہوں (شیخ ابراہیم) نے اپنے روحانی سلسلے کے بانی کا نام اپنے تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے''، اس کے بعد میکالف نے لکھا ہے کہ شیخ محمد ابراہیم کے القاب میں فرید ثانی یا فرید دوئم بھی شامل ہے، شیخ محمد ابراہیم کا لقب فرید ثانی ہوسکتا ہے لیکن تاریخ میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ وہ شاعر تھے اور جب وہ شاعر نہیں تھے تو تخلص کیسا؟ میکالف کا مندرجہ بالا فقرہ ایک مورخ کی رائے یا ایک محقق کی تحقیق نہیں بلکہ ۱۹۰۹ء کے ایک انگریز افسر کا انتظامی حکم تھا جو اس نے فائل پڑھے بغیر لکھ ڈالا، یہ حکم حاکم تھا۔

اس انتظامی حکم کے بعد پچھلے سو سال (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۸ء) سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ یہ شلوک باباصاحبؒ کے ہیں یا شیخ محمد ابراہیم کے ہیں؟ یا کچھ شلوک باباصاحبؒ اور کچھ شیخ محمد ابراہیم کے ہیں؟ طوالت سے بچنے کے لیے اس لاحاصل بحث کے انبار سے صرف دو تبصرے یہاں رقم کیے جاتے ہیں، پہلا تبصرہ ایک پاکستانی مصنف کا ہے جن کا انتخاب علاقۂ ملتان کو نمائندگی دینے کی غرض سے کیا گیا ہے، دوسرا تبصرہ ایک بھارتی مورخ اور محقق کا ہے جن کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ باباصاحبؒ کی مشہور ترین سوانح کے مصنف ہیں، بھارتی مورخ نے اس ایک موضوع پر دو متضاد تبصرے کیے ہیں۔

پاکستانی مصنف کا نام مولانا نور احمد خاں فریدی ہے، ان کا نہ صرف ملتان سے تعلق تھا بلکہ ان کی ساری زندگی اسی علاقے میں مدرسی اور تصنیف و تالیف میں گزری، مولانا فریدی کا تعلق باباصاحبؒ کے خانوادے سے نہیں بلکہ پاکستانی پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کے قصبے مٹھن کوٹ کے مشہور صوفی اور پنجابی زبان کے معروف شاعر خواجہ غلام فریدؒ کی ادارت کی نسبت سے ہے، مولانا فریدی کی ایک کتاب ''مشائخ چشت'' ہے جو قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان نے شائع کی ہے، کتاب پر سال تصنیف یا سنہ اشاعت درج نہیں، صفحات نمبر ۱۳۹/اور ۱۴۴/ پر لکھا ہے:

''صفحہ نمبر ۱۳۹ دنیا میں گنج شکرؒ صرف ایک ہے اور وہ حضرت شیخ

شیوخ العالم فریدالدین گنج شکر قدس سرہ کی ذات والاصفات ہے، بابا فرید بھی صرف ایک ہے اور وہ حضرت ابراہیم فرید ہیں...... صفحہ نمبر ۱۴۴-گرنتھ میں جو شلوک درج ہیں وہ بھی حضرت ابراہیم فریدؒ کے ہیں، گرونانک بھی ان ہی کے معاصر (ہم عصر) تھے''۔

باباصاحبؒ آٹھ صدیوں سے بابا فریدؒ کے نام سے مشہور ہیں، ان کا نام اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ ان کا لقب گنج شکر، مولانا فریدی نے جب قطعیت سے یہ لکھا کہ ''بابا فرید بھی صرف ایک ہے اور وہ حضرت ابراہیم فرید ہیں'' تو اس کے ساتھ ہی انہیں وہ وجوہات اور حقائق بھی درج کرنے چاہیے تھے جن کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے، انہوں نے ایک وجہ بھی نہیں لکھی، اسی طرح انہوں نے گرنتھ صاحب میں درج شدہ شلوکوں کو شیخ ابراہیم کے شلوک قرار دینے کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں بتائی، اشارتاً صرف یہ لکھا کہ وہ گرونانک کے ہم عصر تھے، اگر میکالف کی رائے حکم ہے تو مولانا کی رائے فتوی ہے بلکہ انہوں نے میکالف سے بڑھ کر میکالف کے انداز میں اس کے حکم کی تائید کی ہے۔

بھارتی مورخ اور محقق جن کا تبصرہ اب پیش ہے، وہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ہیں، جو باباصاحبؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، باباصاحبؒ پر اپنی مشہور کتاب کے پہلے (۱۹۵۵ء) اڈیشن میں انہوں نے ''بابا فرید اور گروگرنتھ'' کے عنوان سے ایک خصوصی ضمیمہ شامل کیا جس کا نمبر ''ج'' ہے، اس میں پروفیسر صاحب نے لکھا:

''یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ یہ شلوک عظیم صوفی (باباصاحبؒ) کے تصنیف کردہ نہیں.........ان کے اصل مصنف غالباً شیخ ابراہیم ہیں جو گرونانک کے ہم عصر تھے، انہوں نے اپنے عظیم بزرگ کے بعض اقوال کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر بیان کیا ہے''۔

۱۹۹۸ء میں جب پروفیسر نظامی صاحب کے انتقال سے کچھ عرصے پہلے اس کتاب کا آخری اڈیشن شائع ہوا تو ضمیمہ ''ج'' حذف کردیا گیا، ان کی رائے جو صفحہ نمبر ۱۰۵ پر درج ہے، یہ تھی:

''اس نتیجے سے مفر نہیں کہ گرنتھ صاحب بابا فرید گنج شکرؒ کی حقیق

تعلیمات کی ترجمان ہے .... (علاوہ ازیں) کسی مصنف نے شیخ فرید ثانی
کا ذکر ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں کیا"۔

ہم پروفیسر صاحب کی پہلی رائے پر تبصرہ نہیں کریں گے کیوں کہ وہ بعد میں اس سے دست بردار ہوگئے تھے، ۱۹۵۵ء میں پروفیسر صاحب کو علم نہیں ہوگا کہ "کسی مصنف نے شیخ فرید ثانی کا ذکر ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں کیا"، جب یہ تاریخی حقیقت انہیں معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کرلی جو ایک مستحسن عمل ہے، اگر وہ کھل کر اس کا اظہار بھی کردیتے تو یہ مزید مستحسن عمل ہوتا، ان کی دوسری رائے کے بارے میں ہمارا مختصر تبصرہ فی الحال صرف یہ ہے کہ بنیادی سوال یہ نہیں کہ گرنتھ صاحب میں بابا صاحبؒ سے منسوب اشعار بابا صاحبؒ کی حقیقی تعلیمات کے ترجمان ہیں یا نہیں؟ ترجمانی تو کوئی بھی کرسکتا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ آیا یہ اشعار بابا صاحبؒ کے ہیں؟ اس کے لیے بھی تاریخی حقائق معلوم ہونے ضروری ہیں۔

ان اشعار کو جن حالات میں بابا صاحبؒ سے منسوب کیا گیا اور ان کے بارے میں انگریز، بھارتی اور پاکستانی مصنفین نے جن آرا کا اظہار کیا، جس کی ایک جھلک ہم نے اوپر دیکھی ہے، اس کے پیش نظر ان شلوکوں کا معروضی تجزیہ ضروری ہوجاتا ہے، پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان ۱۳۰/ شلوکوں کے باب کا عنوان "شلوک شیخ فرید جی" ہے لیکن ان میں سے صرف ۱۱۲/ شلوک اور وہ بھی صرف اس عنوان کی رعایت سے، "فرید جی" کے ہیں اور باقی ۱۸/ شلوکوں میں ہر شلوک کے ساتھ اس گرو کا نام درج ہے جس کی وہ تصنیف ہے، ان ۱۸/ شلوکوں کے کوائف یہ ہیں:

نمبر شمار	گرو کا نام	شلوکوں کی تعداد	گرنتھ صاحب میں شلوک نمبر	ریمارک
۱-	نانک (پہلے گرو)	۴	۳۲/۱۱۳/۱۲۰/۱۲۴	------
۲-	امرداس (تیسرے گرو)	۵	۱۳/۵۲/۱۰۴/۱۲۲/۱۲۳	۱۳واں شلوک "پھریدا" سے شروع ہوتا ہے۔
۳-	رام داس (چوتھے گرو)	۱	۱۲۱	------
۴-	ارجن دیو (پانچویں گرو)	۸	۷۵/۸۲/۸۳/۱۰۵/ ۱۰۸/۱۰۹/۱۱۰/۱۱۱	تمام شلوک "پھریدا" سے شروع ہوتے ہیں۔
		۱۸		

"پھریدا" گرمکھی رسم الخط میں "فریدا" کی املا ہے، ان شلوکوں میں "اے فرید" کہہ کر

مخاطب کرنے کے بعد شلوک کہا گیا ہے، ۱۳ویں شلوک میں "پھریدا" آتے ہی شعر خارج از وزن ہوجاتا ہے، گرو ارجن کے آٹھ شلوکوں میں سے صرف دو شلوکوں (۱۰۸/۱۰۹) میں "پھریدا" بروزن ہے، باقی چھ شلوکوں میں بھی یہ لفظ آتے ہی شعر خارج از وزن ہوجاتا ہے، یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گو یہ شلوک گرو صاحبان کی تصنیف ہیں لیکن ان میں ان کا تخلص "پھریدا" ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرید کو مخاطب کرکے یہ شلوک کہہ رہے ہیں اور یہ بات اس وقت تو اور عیاں ہوجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ گرو صاحبان کے یہ شلوک ان شلوکوں کے جواب ہیں جو گرنتھ صاحب میں "پھرید جی" سے منسوب ہیں، جواب میں طرز تخاطب یہی ہوتا ہے۔

اب ان ۱۱۲/ شلوکوں کے کوائف پیش ہیں جو اس مضمون کا موضوع ہیں اور گرنتھ صاحب کے عنوان کی وجہ سے بابا صاحبؒ کا کلام سمجھے جاتے ہیں:

نمبر شمار	تعداد	بروزن	خارج از وزن
۱- شلوک جن کا آغاز "پھریدا" سے ہوتا ہے	۶۸	۱۰	۵۸
۲- شلوک جن کے پہلے مصرعے کے وسط میں "پھریدا" ہے	۰۳	۰۳	-
۳- شلوک جس کے وسط میں "سیکھ پھرید" ہے۔	۰۱	۰۱	-
۴- شلوک جن کے دوسرے یا آخری مصرعے میں "پھریدا" ہے۔	۱۳	۰۲	۱۱
۵- شلوک جن میں "پھریدا" استعمال نہیں ہوا۔	۲۷	-	-
کل تعداد:	۱۱۲		

ان کوائف سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ تینوں شلوک جن کے پہلے مصرعے کے وسط میں "پھریدا" آیا ہے، وزن پر پورے اترتے ہیں، تاہم جن ۶۸ شلوکوں میں آغاز "پھریدا" سے ہوتا ہے، ان میں سے ۵۸ شلوکوں میں یہ لفظ لگنے سے شعر خارج از وزن ہوجاتا ہے، یہ لفظ ہٹا دیا جائے تو شعر کا وزن قائم ہوجاتا ہے، جن ۱۳/ شلوکوں کے دوسرے یا آخری

مصرعے میں ''پھریدا'' کا استعمال ہوا ہے۔ان میں سے ۱۱/ شلوک اس لفظ کی وجہ سے خارج ازوزن ہو جاتے ہیں،ایک شلوک (نمبر ۴۱) کے وسط میں ''پھریدا'' کی بہ جائے ''سیکھ پھریدؤ'' یعنی ''شیخ فریدؤ'' کے الفاظ کے استعمال سے شعر بروزن تو ضرور ہو گیا ہے لیکن سوچنے کا مقام ہے کہ کیا بابا صاحبؒ اپنے کلام میں اپنے لیے ''شیخ فریدؤ'' کا لقب یا تخلص استعمال کریں گے؟ کیا بوستان میں سعدی نے اپنے لیے شیخ سعدی، مثنوی میں رومی نے اپنے لیے مولانا رومی یا دیوان غالب میں غالب نے اپنے لیے مرزا غالب کا تخلص استعمال کیا ہے؟ ''شیخ فریدؤ'' کا تعظیمی لقب تو کوئی اجنبی استعمال کرے گا، یہ الگ بات ہے کہ اس لقب کے استعمال سے شعر کا وزن قائم ہو گیا ہے، کیا خبر کہ مقصد بھی یہی ہو؟ دوسری بات یہ ہے کہ شعرا آخری مصرعے میں اپنا تخلص استعمال کرتے ہیں، ۱۱۲/ شلوکوں میں سے ۶۸/ شلوکوں یعنی ۶۰% شلوکوں کا آغاز ''پھریدا'' سے ہونا عجیب لگتا ہے اور جب یہ انکشاف ہو کہ اس آغاز کی وجہ سے ۶۸ میں سے ۵۸ شلوک خارج ازوزن ہو گئے تو یہ بات عجیب تر لگتی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ جب شاعر نے ۸۴ شلوکوں میں ''پھریدا'' استعمال کیا تو ۲۷ شلوکوں میں یہ لفظ استعمال کرنے سے کیوں اجتناب کیا، یہ ان کوائف پر پہلا تبصرہ ہے۔

دوسرا تبصرہ یہ ہے کہ ''شلوک شیخ فرید جی'' کے خصوصی عنوان کے تحت فرید جی کے ساتھ گروصاحبان کے شلوک کیوں شامل کیے گئے؟ اگر گروارجن کی کرپا سے، ان ۱۸/اشلوکوں کے ساتھ ان کے مصنف گروصاحبان کے نام نہ لکھ دیے جاتے تو خصوصی عنوان کی رعایت اور نفس مضمون اور اسلوب بیان کی مشابہت کی وجہ سے آج کون یہ نہ سمجھتا کہ یہ ۱۸/ شلوک بھی ''پھرید جی'' کے ہیں؟ ان ۱۸/ شلوکوں کو اس خصوصی عنوان کے تحت شامل کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ گروصاحبان کے یہ شلوک ''پھرید جی'' کے پچھلے شلوک کی توضیح یا جواب میں درج کیے گئے ہیں۔

اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے ہم چاروں گروصاحبان کا ایک ایک شلوک لے کر، اس کا مقابلہ ''پھرید جی'' کے متعلقہ پچھلے شلوک سے کرتے ہیں، اختصار کی خاطر پنجابی متن کی بجائے صرف اس کا اردو ترجمہ درج کیا گیا ہے، سہولت کے لیے پہلے ''پھرید جی'' سے منسوب

شلوک اور پھر گروصاحبان کا جواب یا وضاحت درج ہے۔

تقابل کا آغاز گرونانک سے کیا جاتا ہے جس کے لیے شلوک نمبر ۳۱/ اور ۳۲ پیش ہیں، ''پھرید جی'' سے منسوب شلوک نمبر ۳۱ کا ترجمہ یہ ہے:

''(جس عورت کو) سسرال میں سہارا اور میکے میں ٹھکانا نہ ملے اور جس کا خاوند اس سے بات نہ کرے، اس عورت نے (اپنا) نام سہاگن رکھا ہے؟''

مطلب یہ ہے کہ وہ عورت کیا خاک سہاگن کہلائے گی جس کی جگہ نہ میکے میں ہو نہ سسرال میں اور جس کا خاوند اسے منہ نہ لگائے، یہاں میکہ اس جہاں کے لیے سسرال اگلے جہاں کے لیے اور خاوند خدا کے لیے استعمال ہوئے ہیں، شلوک نمبر ۳۲ میں گرونانک کا جواب ہے:

''میکہ ہو یا سسرال، عورت اپنے خاوند کی رہتی ہے، (ایسا) خاوند جس کی اتھاہ نہیں (اور جو) بے پرواہ ہے، اصل سہاگن تو وہی ہے جو اس بے پرواہ کو بھا جائے''۔

گرونانک کے شلوک میں رجائیت اور آفاقیت رچی ہوئی ہے جبکہ ''پھرید جی'' سے منسوب شلوک سے مایوسی ٹپکتی ہے، قاری خود فیصلہ کرے کہ ''لا تقنطوا من رحمة اللہ'' میں ایمان رکھنے والا وہ عظیم صوفی جس نے کہا تھا کہ ''چالیس سال تک مسعود نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا، اب جو مسعود چاہتا ہے وہ کر دیا جاتا ہے'' کیا اپنے عالم پیری میں وجدانی کیفیت میں ایسا شعر کہے گا جس کا منفی اثر زائل کرنے کے لیے یہ مثبت وضاحت پیش کرنے کی حاجت ہو۔

گرونانک کے بعد اب تیسرے گروامرداس کا جواب دیکھتے ہیں جس کے لیے شلوک نمبر ۱۲/ اور ۱۳ پیش ہیں، ''پھرید جی'' سے منسوب شلوک نمبر ۱۲ کا ترجمہ یہ ہے:

''اے پھرید! جنھوں نے کالے بالوں (جوانی) کے زمانے میں راضی نہ کیا، شاید ہی کوئی سفید بالوں (بڑھاپے) کے زمانے میں اسے راضی کر سکے گا، سائیں سے پیار کر، رنگ نیا ہوگا''۔

شلوک نمبر ۱۳ میں گروامرداس کا جواب ہے:

''اے پھرید! عمر کالے بالوں کی ہو یا سفید بالوں کی، ''صاحب''

سدا رہتا ہے، بہ شرطے کہ کوئی اس پر غور کرے، پریم اپنے ارادے سے نہیں ہوتا،
گو چاہتے سب ہی یہ ہیں، پریم کا پیالہ تو خصم (صاحب) کی دین ہے، وہ جسے
بھائے دے دیتا ہے"۔

عشقِ الٰہی میں جس طرح ذات پات، نسل، رنگ اور جنس کی قید نہیں، اسی طرح عمر کی بھی قید نہیں، یہ تو مولا کی دین ہے، وہ جسے جب اور جہاں چاہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور بعض اوقات ایسے دیتا ہے کہ ملنے والے سے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا   یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے

باباصاحبؒ سے منسوب مندرجہ بالا شلوک نمبر ۱۲ کے بارے میں، ہم ایک فاضل تبصرہ نگار کا یہ عالمانہ تبصرہ نقل کریں گے:

"پہلے مصرعے (اے پھرید! جنھوں......) کے معنی کا حقہ سمجھنے میں یہ
دقت ہے کہ (لفظ) "جنھوں" کے جواب میں گرامر (لفظ) "انھوں" یا (لفظ)
"وہ" کا تقاضا کرتی ہے لیکن یہاں ایسا کوئی جواب نہیں دیا گیا، بلکہ جواب کو
تشنہ چھوڑ کر ایک نیا جملہ...... لے آیا گیا ہے، تاہم الکل سے ان دونوں ٹکڑوں کو
ملا کر یہ معنی پیدا کیے جاسکتے ہیں کہ جنھوں نے جوانی میں یادِ خدا نہ کی، ان میں
سے شاید ہی کوئی بڑھاپے میں یادِ خدا کرے گا، دوسرا مصرع پہلے سے پوری
طرح پیوستہ نہیں (جو ایک مکمل شعر میں ہونا چاہیے) بلکہ ایک علاحدہ مضمون
بیان کرتا ہے"۔

معلوم ہوا کہ اولاً لفظ "پھریدا" کی وجہ سے پہلا مصرع خارج از وزن ہو گیا، ثانیاً پہلا مصرع نامکمل ہے، ثالثاً پہلے اور دوسرے مصرعوں میں ربط نہیں، باباصاحبؒ صاحب کلام شاعر تو نہیں تھے لیکن قادر الکلام عالم تھے، کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسا شعر کہیں گے جو نہ وزن پر پورا ہو اور نہ جس کے دونوں مصرعے مربوط ہوں؟ سب سے اہم بات نفسِ مضمون کی ہے، کیا ان کا الہامی کلام رضائے الٰہی کے لیے عمر کو حدِ فاصل قرار دے سکتا ہے؟ فیصلہ قاری پر ہے۔

پہلے اور تیسرے گرو صاحبان کے بعد اب چوتھے گرو رام داس کا جواب دیکھتے ہیں

جس کے لیے شلوک نمبر ۱۱۹/۱۲۰/اور ۱۲۱ پیش ہیں، "پھرید جی" سے منسوب شلوک نمبر ۱۱۹ کا ترجمہ یہ ہے:

"(میرا) تن تنور کی طرح تپتا ہے، میری ہڈیاں خشک لکڑیوں کی مانند
سلگتی ہیں، پاؤں تھک جائیں تو میں سر کے بل چلوں گا، اگر میرا پیارا مجھے اسی
طرح مل سکے"۔

اس کا جواب، اس باریک کی بہ جائے دو شلوکوں میں دیا گیا ہے، پہلے گرونانک کا شلوک نمبر ۱۲۰، اور پھر گرو رام داس کا شلوک نمبر ۱۲۱، گرونانک کے شلوک کا ترجمہ یہ ہے:

"اپنے آپ کو تنور کی طرح نہ تپا اور نہ ہی اپنی ہڈیوں کو جلا، تیرے سر
اور پاؤں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ اپنے اندر جھانک اور اپنے پیارے کو دیکھ لے"۔

گرو رام داس کا شلوک نمبر ۱۲۱ جو گرنتھ صاحب کے اس باب میں لکھا ان کا اکلوتا شلوک ہے، یہ ہے:

"میں اپنے سجن کو ڈھونڈتی پھرتی ہوں (حالاں کہ) سجن میرے ساتھ ہے، نانک اس
"نظر نہ آنے والا" کا مکھڑا گرو دکھاتا ہے"۔

گرو رام داس کے شعر میں، ان کی بہ جائے نانک کا نام آنے کی توجیہ یہ ہے کہ گرونانک کے بعد ہونے والے گرو صاحبان نے بہ مطابق رواج اور از راہِ احترام اپنے اشعار میں اپنے نام کی بہ جائے، اپنے اولین گرو کا نام استعمال کیا ہے، یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر شلوک کسی کا ہے لیکن شلوک میں نام نانک کا آیا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ گرنتھ صاحب کے جن ۸۵ شلوکوں میں "پھریدا" یا "سیکھ پھریدو" کے الفاظ استعمال ہوئے ہوں، وہ شلوک بھی کسی اور کے ہوں اور بعد میں ان میں "پھریدا" کا اضافہ کر دیا گیا ہو، خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان ۸۵ شلوکوں میں سے ۶۸ شلوکوں میں "پھریدا" نہ صرف پہلے مصرعے میں آیا ہے (جبکہ شعری روایت کے مطابق تخلص آخری مصرعے میں ہوتا ہے) بلکہ ان تمام ۶۸ شلوکوں میں یہ پہلے مصرعے کا پہلا لفظ ہے اور ان ۶۸ شلوکوں میں سے ۵۸ شلوکوں میں یہ لفظ آتے ہی شعر خارج از وزن ہو جاتا ہے، تو یہ بات زیادہ وزن دار لگتی ہے، تاہم چوں کہ یہ استدلال ایک مفروضے پر مبنی ہوگا، اس

لیے ہم اسے نظر انداز کریں گے، ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ باباصاحبؒ جیسی خداشناس اور خودشناس ہستی جو تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح اور تخلیۂ روح وقلب کی وہ منازل طے کرچکی ہو کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے، اس کے عالم جوانی میں اس کے بارے میں کہا ہو کہ ''یہ عظیم شہباز سدرۃ المنتہٰی سے ورے ٹھکانا نہیں کرے گا''، اس کی زبان سے شلوک نمبر ۱۱۹ کے وہ الفاظ نکلنے مشکل ہیں جو اس سے منسوب کیے گئے ہیں اور جن کے جواب یا وضاحت میں گرو ارجن دیو کو ایک کی بہ جائے دو شلوکوں کو لانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی، فیصلہ پھر قاری پر ہے۔

اب پانچویں گرو ارجن دیو کا جواب دیکھتے ہیں جس کے لیے شلوک نمبر ۸۱/۸۲ پیش ہیں، ''پھرید جی'' سے منسوب شلوک نمبر ۸۱ کا ترجمہ یہ ہے:

''اے پھرید! میں تو سمجھا تھا کہ دکھ صرف مجھے ہی ملا ہے لیکن یہ دکھ تو سب انسانوں کا مقدر ہے، جب میں نے بلندی پر چڑھ کر دیکھا تو ہر گھر یہ آگ بھڑک رہی تھی''۔

جواب میں گرو ارجن شلوک نمبر ۸۲ میں کہتے ہیں:

''اے پھرید! اس رنگ برنگی دنیا کے بیچ میں ایک زہریلا باغ بھی ہے
لیکن جسے پیر نوازے اسے آنچ نہیں آتی''۔

گرو ارجن کے شلوک پر یہ فنی اعتراض بجا طور پر کیا گیا ہے کہ ''زہر سے آنچ کی طرف آنا کچھ غیر فصیح نظر آتا ہے''، آنچ کا تعلق آگ سے ہے نہ کہ زہریلے باغ سے، تاہم ہماری توجہ کا مرکز فنی اعتراض نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا ''بلندی'' پر چڑھ کر باباصاحبؒ کو ہر گھر میں دکھوں کی آگ دکھائی دی؟ بلندی پر چڑھ کر تو خدا جانے باباصاحبؒ کو کیا نظر آتا ہوگا؟ باباصاحبؒ ایک شمع کی مانند تھے جو ہر وقت اللہ کی یاد اور محبت میں جلتی رہتی تھی، اس آگ میں حب الٰہی کا نور تھا، وہ درد و سوز کو نعمت سمجھتے تھے اور اکثر لوگوں کو یہ دعا دیتے: ''اللہ تمھیں درد و سوز عطا کرے''، تاہم اس درد میں اور اس دکھ میں جسے شلوک نمبر ۸۱ میں سب انسانوں کا مقدر بتایا گیا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے، ایک درد وہ ہے جس کے پانے کے لیے دعا دی جاتی تھی، ایک دکھ وہ ہے جس سے بچنے کے لیے دعا مانگی جاتی ہے۔

اس تجزیے کو ہم شلوک نمبر ۷۰ پر ختم کرتے ہیں، ہم بہ وجوہ پہلے اس کا پنجابی متن حرف بہ حرف نقل کریں گے اور پھر شلوک کا پہلا لفظ چھوڑ کر اس کا ترجمہ پیش کریں گے، پنجابی متن یہ ہے:

پھریدا بے نواجا کتیا ایہہ نہ بھلی ریت   کبھی چل نہ آئیا پنجے وکھت مسیت

پہلا لفظ چھوڑ کر، بقیہ شلوک کا ترجمہ یہ ہے: ''.......... اے بے نماز کتے! یہ ریت اچھی نہیں کہ تو کبھی پانچوں وقت مسجد چل کر نہیں آیا''۔

واضح رہے کہ یہ شلوک گرو صاحبان کے انتخاب کے بعد گرنتھ صاحب میں شامل ہوا ہے، پہلے لفظ کی بے ادبی سے احتراز کرنے کے لیے، شارحین نے شلوک کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ ''پھرید جی'' بے نمازیوں کو کتا کہہ رہے ہیں، حالاں کہ شلوک کا پہلا لفظ کلمہ خطاب ہے جس میں یا تو ''پھرید جی'' خود سے مخاطب ہیں یا کوئی اور ان سے مخاطب ہے، اس لفظ کے اضافی ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ اس کے شامل کرتے ہی شعر خارج از وزن ہوجاتا ہے، باباصاحبؒ لوگوں سے ہمیشہ پیار اور بسا اوقات احترام سے مخاطب ہوتے تھے، وہ اپنے ان مریدوں کو جو ان کے پڑپوتوں کی عمر کے تھے، بعض اوقات مولانا کہہ کر مخاطب ہوتے تھے، ان کی زبان بھی ان کی روح، جسم اور خیالات کی طرح پاک تھی، ایسے انسان کی زبان سے ایسا عامیانہ شعر نکلنا ناممکن ہے، اس بار ہم فیصلہ قاری پر نہیں چھوڑیں گے۔

گرنتھ صاحب میں ''سیکھ پھرید جی'' کے عنوان کے تحت درج شلوکوں کی تاریخ تین ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے:

۱- پہلا دور ۱۲۷۱ء سے ۱۶۰۴ء تک = ۳۳۳ سال۔
۲- دوسرا دور ۱۶۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک = ۳۰۵ سال۔
۳- تیسرا دور ۱۹۰۹ء سے ۲۰۰۸ء تک = ۹۹ سال۔
۷۳۷ سال

پہلے دور میں باباصاحبؒ کی ملتانی بولی میں شاعری کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا، حالاں کہ اس دور میں شاعری کا رواج تھا اور نثر صرف، سیرت، سوانح، نصائح اور تاریخ کی گنی چنی کتابوں تک محدود تھی، نثر کی یہ کتابیں بھی اشعار سے بھری ہوتی تھیں، اگر جواب میں کہا جائے کہ اس دور

میں چوں کہ ملتانی صرف ایک بولی تھی، اس لیے باباصاحب کا سو سے زائد اشعار پر مشتمل یہ کلام کاغذ کی بہ جائے دماغ میں محفوظ کیا گیا تھا اور مثال کے لیے امیر خسرو کا ہندوی کلام پیش کیا جائے جو ابتدا میں صرف دماغوں میں محفوظ تھا، تب بھی اس کا کیا جواب ہوگا کہ امیر خسرو کا ہندوی کلام ان کی حیات میں ہی ان کے نام سے مشہور ہوگیا تھا، جب کہ باباصاحبؒ کا مبینہ ملتانی کلام نہ باباصاحبؒ کی حیات میں ان کے نام سے مشہور تھا نہ ان کے وصال کے بعد، ان کے ہم عصروں یا ان کے قریب العہد ہم عصروں نے اس بارے میں کوئی ذکر کیا۔

ہم عصروں میں سے خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا ذکر اس مضمون کے ابتدا میں ہو چکا ہے اور یہ ایک مثال بہت کافی ہے، اب قریب العہد ہم عصروں میں سے بھی ایک ایک مثال دی جاتی ہے جس کے لیے ہم نے ایک انتہائی مشہور مورخ اور ایک انتہائی معروف سیرت نگار کو چنا ہے، مورخ ضیاء الدین برنی ہیں جن کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ مشہور زمانہ تاریخ باباصاحبؒ کے وصال کے تقریباً ۸۷ برس بعد ۱۳۵۸ء کے لگ بھگ لکھی گئی، اس کے صفحات میں باباصاحبؒ کا ذکر بہت عقیدت سے کیا گیا ہے، تاہم باباصاحبؒ کے ملتانی بولی کے شاعر ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔

سیرت نگاروں میں ہمارا انتخاب قدرتی طور پر امیر خورد کرمانی ہیں، ان کا انتقال بابا صاحبؒ کے وصال کے تقریباً ایک صدی بعد ہوا، ان کی مشہور ''سیر الاولیا'' ''تاریخ فیروز شاہی'' کے بعد لکھی گئی، سیر الاولیا اشعار سے پر ہے لیکن اس میں بھی باباصاحبؒ کے ملتانی بولی کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں ملتا، یاد رہے کہ امیر خورد کرمانی، امیر خسرو اور ''فوائد الفواد'' کے مرتب امیر حسن علا سجزی تینوں شاعر تھے، کسی نے باباصاحبؒ کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔

ان قریب العہد معاصرین کے بعد اس ۳۳۳ سالہ دور اول میں باباصاحبؒ کے چاہنے والوں میں بہت سے صاحب علم، صاحب ثروت اور شعر و سخن کے دل دادہ اور سرپرست حضرات گزرے ہوں گے، ایک ایسے دور میں جہاں ہر طرف شاعری کا چرچا تھا، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس طویل عرصے میں کوئی ایک فرد جن میں باباصاحبؒ کی اپنی آل اولاد بھی شامل ہے، اپنے مرشد اعلا یا فخر خاندان کے ملتانی بولی کے کلام کے بارے میں ایک لفظ نہ لکھتا؟ فیصلہ قاری پر ہے۔

دوسرے دور کے آغاز سے ۳۰ برس پہلے جب تیسرے گرو امرداس نے ''گرنتھ صاحب'' دو جلدوں میں مرتب کی تو اس کے باوجود کہ اس کے اوراق کی تعداد تک متعین ہو چکی ہے، اس میں باباصاحب سے منسوب کلام نہیں تھا، یہ سوال تشنہ ہے کہ کیوں نہ تھا؟ اور ۳۰ سال بعد کیسے ہوگیا؟ اس طرح پہلے دور میں جس میں سکھوں کے پہلے چار گرو صاحبان کے ادوار بھی آتے ہیں، باباصاحبؒ سے منسوب ملتانی بولی کا یہ کلام سامنے نہیں آتا۔

۱۶۰۴ء سے وہ دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب یہ کلام گرنتھ صاحب کے صفحات پر پہلی بار، گرمکھی رسم الخط میں سامنے آتا ہے اور اس کے بعد اگلی تین صدیوں تک باباصاحبؒ کے کلام کے طور پر مشہور رہتا ہے، دوسرے الفاظ میں پہلے دور کی تین صدیوں میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ بابا صاحبؒ ملتانی بولی کے شاعر تھے (اور اگر وہ نہیں تھے تو کسی کو کہنے کی ضرورت کیا تھی؟)، دوسرے دور کی تین صدیوں میں کسی نے اس تحقیق کی زحمت نہیں اٹھائی کہ کیا باباصاحبؒ سے منسوب کیا جانے والا یہ کلام واقعی باباصاحبؒ کا ہے؟ اسی دور میں معروف عالم اور محقق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱ء تا ۱۶۲۴ء) نے صوفیہ کی مشہور سوانح ''اخبار الاخیار'' تصنیف کی، وہ گرو ارجن دیو (۱۵۶۳ء تا ۱۶۰۶ء) کے ہم عصر تھے، گرنتھ صاحب اور اخبار الاخیار دونوں ۱۷ویں صدی کے آغاز میں شائع ہوئیں اور قوی امکان ہے کہ پہلے گرنتھ صاحب شائع ہوئی، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں جن صوفیہ کے شعرا ہونے کا ذکر کیا ہے ان میں شرف الدین بوقلندرؒ، سید محمد گیسو درازؒ، امیر حسن علا سجزیؒ، امیر خسروؒ اور باباصاحبؒ کے ممتاز خلیفہ جمال الدین ہانسویؒ شامل ہیں لیکن باباصاحبؒ شامل نہیں ہیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا وصال گرو ارجن دیو کے انتقال کے ۳۶ برس بعد، گویا گرنتھ صاحب کی تکمیل ۳۸ برس بعد ہوا، اگر ۱۲۷۱ء سے پہلے سعدی کے شعر شیراز سے پاک پتن پہنچ سکتے تھے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ۱۲۷۱ء کے ساڑھے تین صدی بعد جب باباصاحبؒ کے مبینہ شلوک پنجاب میں اتنے مقبول ہو چکے ہوں کہ ان میں سے ۱۱۲ شلوک منتخب کر کے گرنتھ صاحب میں شامل ہو چکے ہوں، ان شلوکوں کی صدائے بازگشت پنجاب سے اس کی ہمسائی دلی تک نہ پہنچی ہو؟ اگر دلی پہنچی تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے کانوں میں پڑتی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ باباصاحبؒ کے ایک خلیفہ کا ذکر تو شاعر کی حیثیت سے کرتے لیکن

بابا صاحبؒ کا ذکر نہ کرتے۔

۱۹۰۹ء سے تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جس کے لیے ہمیں میکالف کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کے احمقانہ "انطامی حکم" کی وجہ سے اس کلام پر محققانہ بحث کا آغاز ہوا، اس سو سالہ دور میں بحث اس نکتہ کے گرد گھومتی رہی کہ آیا یہ کلام بابا صاحبؒ کا ہے یا شیخ ابراہیم کا ہے یا اس کا کچھ حصہ بابا صاحبؒ اور باقی شیخ ابراہیم کا ہے؟ اور اگر آخری نکتہ درست ہے تو کون سے شلوک، کس بنیاد پر، بابا صاحبؒ کے ہیں اور کون سے شلوک، کس بنیاد پر شیخ ابراہیم کے ہیں؟

ان تین نکات کی سو سالہ لاحاصل بحث میں الجھ کر کسی نے تا حال یہ نکتہ نہیں اٹھایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ شلوک نہ بابا صاحبؒ کے ہوں، نہ شیخ ابراہیم کے ہوں بلکہ کسی اور کے ہوں؟

بابا صاحبؒ سے منسوب ۱۱۲/ شلوکوں میں سے ۶۹ شلوک یعنی تقریباً دو تہائی شلوک خارج از وزن ہیں، اس کی واحد وجہ لفظ "پھریدا" کا بے جا استعمال ہے جو ان ۶۹ شلوکوں میں ۵۸ بار پہلے مصرعے کے آغاز اور ۱۱/ بار دوسرے یا آخری مصرعے میں آتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ لفظ کس نے کب اور کیوں شامل کیا؟ تاہم گرو ارجن جنھوں نے "شلوک سیکھ پھرید جی" کے عنوان کے تحت یہ شلوک گرنتھ صاحب میں ۱۶۰۴ء میں شامل کیے، انھوں نے اسی عنوان کے تحت اپنے نام کے ساتھ جو ۸ شلوک گرنتھ صاحب میں شامل کیے، ان سب کا آغاز بھی اسی لفظ "پھریدا" سے ہوتا ہے۔

گرو ارجن کے مندرجہ بالا شلوکوں میں سے دو شلوکوں (نمبر ۱۰۸/۱۰۹) میں "پھریدا" کے شمول سے شعر کا وزن قائم رہتا ہے لیکن باقی چھ شلوکوں میں یہ لفظ آتے ہی وزن ساقط ہو جاتا ہے، گویا "پھریدا" کا لفظ آنے سے اگر بابا صاحبؒ سے منسوب دو تہائی شلوک خارج از وزن ہوتے ہیں تو گرو ارجن کے تین چوتھائی شلوک خارج از وزن ہو جاتے ہیں، اس طرح گرنتھ صاحب ہی بابا صاحبؒ سے منسوب شلوکوں اور شاعری کا خداداد ملکہ رکھنے والے گرو ارجن کے تصدیق شدہ شلوکوں میں لفظ "پھریدا" کے کثرت استعمال اور خارج از وزن شلوکوں کے تناسب دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

گرونانک کے زمانے سے سکھوں کو بابا صاحبؒ سے جو عقیدت رہی ہے وہ دنیا کو معلوم ہے، عقیدت کا یہ عرصہ تقریباً پانچ صدیوں پر محیط ہے، پاکستان میں بابا صاحبؒ کے نام پر کوئی اہم ادارہ قائم نہیں، بھارتی پنجاب میں ان کے نام پر یونی ورسٹیاں قائم ہیں، ان کے کلام پر تحقیق جاری ہے، سکھوں کے لیے گرنتھ صاحب کا وہی مقام ہے جو مسلمانوں کے لیے قرآن ہے، یہ مذہبی مقام اس تحریر میں اٹھائے گئے نکات کی معروضی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتا ہے، تاہم اگر بابا صاحبؒ سے منسوب یہ ۱۱۲ شلوک بابا صاحبؒ کے نام پر، صدیوں سے، مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے ہیں تو بابا صاحب کے چاہنے والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان مکھیوں کو اڑا دیں۔

بابا صاحبؒ ہوں یا گرونانک، یہ توحید پرست زندگی بھر سچ کے علم بردار اور حق کے متلاشی رہے، اکیسویں صدی عیسوی کے سکھ علما اور محققین سے ہماری استدعا صرف یہ ہے کہ وہ سچ کی تلاش میں دیر نہ کریں، گرنتھ صاحب میں بابا صاحبؒ سے منسوب کلام کے بارے میں حرف اول سکھوں کے گرو حضرات کی طرف سے آیا تھا، اس کے بارے میں حرف آخر بھی سکھ محققین کی طرف سے آنا چاہیے، یہ ان کا مذہبی حق بھی بنتا ہے اور ان کا تاریخی فرض بھی۔

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود "تذکرہ ید بیضا" کے قلمی نسخوں کا تفصیلی تعارف

از:- ڈاکٹر زرینہ خان☆

حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی اٹھارہویں صدی عیسوی کے ان علمائے گرامی میں سے تھے جن کا نام علم وادب کی تاریخ میں ہمیشہ ثبت رہے گا، آزاد بلگرامی عالم وفاضل ہی نہیں، ادیب، شاعر، مورخ، تذکرہ نگار اور محقق بھی تھے، ان کا شمار ہندوستان کے ان جید علما میں ہوتا تھا جو فن شعر گوئی اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ کثیر التصانیف مصنف تھے اس کی شاہد ان کی متعدد تصنیفات ہیں جو عربی اور فارسی میں موجود ہیں، زیر نظر مقالے میں آزاد بلگرامی کے اولین تذکرہ "ید بیضا" کے قلمی نسخے جو مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ان کی کسی قدر تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود تین قلمی نسخوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

لیکن ید بیضا کے قلمی نسخوں پر بحث وگفتگو سے پیش تر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، آزاد نے اپنی بیش تر سوانح خود اپنی تصنیفات میں قلم بند کی ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی ولادت ۲۵ رصفر، یکشنبہ ۱۱۱۶ھ میں محلہ میدان پورہ، قصبہ بلگرام، ضلع ہردوئی، صوبہ اودھ میں ہوئی تھی۔(۱)

ان کے والد کا نام میر محمد نوح تھا، ان کا سلسلۂ نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید امام زین العابدین تک پہنچتا تھا، جیسا کہ آزاد بلگرامی خود گویا ہیں

☆ شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

گرچہ موتم الاشبال عیسیٰ جد من
عیسیٰ جان بخش شیرانم بہ امداد نفس(۲)

آزاد نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی سے حاصل کی، اس کے علاوہ ان کے استادوں میں مولانا الشیخ محمد حیات السندھی المدنی اور شاہ لدھا بلگرامی تھے۔

آزاد نے اپنی زندگی میں صرف تین بار سفر کیے(۳) پہلا سفر ۱۱۳۴ھ میں میر عظمت اللہ بلگرامی کے ہم راہ شاہ جہاں آباد کا کیا، اس کا مقصد ملازمت کا حصول تھا اور وہاں اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے پاس قیام کیا(۴)، دوسرا سفر ۱۱۴۲ھ میں سیستان، ملتان، لاہور اور جہان آباد کا کیا تھا، جہاں وہ اپنے ماموں سید محمد بلگرامی سے ملے اور ان کے یہاں چار سال تک قیام کیا، اسی سفر کے دوران ان کی ملاقات شیخ علی حزیں سے ۱۱۴۷ھ بھکر کے مقام پر ہوئی، شیخ علی حزیں آزاد کے ہم عصر اور اعلا پایہ کے شاعر تھے، انہوں نے آزاد کو اپنی غزلوں کا دیوان بہ طور تحفہ دیا(۵)، تیسرا سفر آزاد نے ۱۱۵۰ھ میں حج بیت اللہ کا کیا اور دو سال بعد مکہ معظمہ سے واپس آئے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں آزاد بلگرامی اورنگ آباد، دکن میں مقیم ہوگئے تھے، ۱۲۰۰ھ میں یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں دفن ہوئے۔(۶)

آزاد بلگرامی کو عربی اور فارسی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی، انہوں نے بہت سی کتابیں، تذکرے اور دواوین عربی اور فارسی زبان میں یادگار چھوڑے ہیں، فارسی زبان میں شعرا کے کئی تذکرے تصنیف کیے، ان کا پہلا تذکرہ "ید بیضا" ہے جو ۱۱۴۸ھ میں تالیف ہوا، ید بیضا کے تفصیلی ذکر سے پہلے آزاد بلگرامی کے دوسرے فارسی شعرا کے تذکروں سے متعلق اطلاعات پہنچانا مناسب معلوم ہوتا ہے، دوسرا تذکرہ شعرا، فضلا اور فقرا کا ترتیب دیا جو کافی ضخیم ہوگیا، اس وجہ سے آزاد نے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا، پہلا حصہ "مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام" کے نام سے موسوم ہوا جس میں بلگرام کے فقرا ومشائخ اور فضلا کے تذکرے قلم بند کیے اور دوسرے حصے میں شعرا کے تذکرے شامل ہیں اور اس کا نام "سرو آزاد" رکھا، اس تذکرے میں ۱۰۰۰ھ سے لے کر اپنے عہد تک کے تقریباً ۱۴۳ فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے، سرو آزاد ۱۱۶۶ھ میں تالیف ہوا، ۱۱۷۶ھ میں آزاد بلگرامی نے ایک اور شعرا کا تذکرہ تصنیف کیا جس میں خصوصیت کے ساتھ ان

شعرا کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی بادشاہ، شہزادے، امیر یا کسی منصب دار کے دربار سے وابستہ اور انعام یافتہ تھے، انہوں نے صوفیوں کا ایک تذکرہ بھی تصنیف کیا جس کا نام ''روضۃ الاولیا'' ہے۔

تذکرہ ید بیضا آزاد بلگرامی کا اولین فارسی شعرا کا تذکرہ ہے، یہ عمومی تذکرہ ہے، اس میں ابتدا سے لے کر مصنف نے اپنے عہد تک کے فارسی شعرا کا تذکرہ کیا ہے، اس تذکرے میں تقریباً بارہ سو چوون (۱۲۵۴) شعرا کا ذکر ہے۔

تذکرہ ید بیضا کی تالیف کے متعلق آزاد بلگرامی تذکرہ سرو آزاد میں رقم طراز ہیں کہ ''انہوں نے اس تذکرے کا مسودہ سیستان میں مرتب کیا تھا اور اس کے بعد ترمیم اور اضافے کیے''، ید بیضا کا پہلا نسخہ نامکمل تھا اور اس میں خامیاں رہ گئیں تھیں جن کو آزاد نے بعد میں خود درست کیا اور مزید اضافے اور ترمیم کے بعد دوسرا نسخہ تیار کیا جو پہلے نسخے سے زیادہ مکمل اور بہتر تھا، ان دونوں نسخوں کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی یہ مقبول عام ہوا، ید بیضا ایک گراں قدر اور اہم ترین تذکرہ ہے، اس تذکرے کی تالیف کی تاریخ خود آزاد نے ''طبع کالیم ید بیضا نمود'' ۱۱۴۸ھ لکھی ہے۔

تذکرے میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، آزاد نے پہلے ان شعرا کا تخلص، پورا نام، تاریخ ولادت (اگر معلوم ہوئی) واقعات زندگانی اور تاریخ وفات وغیرہ لکھے ہیں اور آخر میں ان کے دیوان سے اشعار کا عمدہ انتخاب پیش کیا ہے، شعرا کے احوال زندگی کے متعلق مواد کی فراہمی میں آزاد بلگرامی نے کافی محنت و مشقت اور عرق ریزی کی ہے، اس کے لیے انہوں نے مختلف کتابوں تذکروں اور تاریخی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے، جن شعرا سے آزاد ذاتی طور پر واقفیت رکھتے تھے ان کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات کا بیان اپنے دلکش انداز میں کیا ہے، حتی المقدور شعرا سے متعلق اہم اور مفید معلومات مہیا کی ہیں، اکثر شعرا سے متعلق جو اطلاعات آزاد بلگرامی نے فراہم کی ہیں وہ دوسرے تذکروں میں ہم کو نہیں ملتی ہیں۔

شعرا کے کلام کا جو انتخاب کیا ہے وہ دواوین، کلیات اور شعری مجموعوں کے گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی کیا ہے۔

آزاد بلگرامی کے زمانے میں تذکرہ نویسی کا ایک خاص طرز رائج تھا، ان کے اور ان

سے پہلے کے دور میں لکھے گئے تذکروں میں عموماً تذکرہ نگار شعرا کے تخلص، نام، مختصر احوال زندگی اور اشعار کا انتخاب دینے پر اکتفا کرتے تھے لیکن آزاد بلگرامی جو نہ صرف تذکرہ نویس بلکہ شاعر، ادیب، مورخ اور تنقید نگار بھی تھے، انہوں نے شعرا کے کلام پر مختصر مگر جامع نقد کیا ہے، اکثر شعری محاسن کو بھی بیان کیا ہے، دوسرے شعرا کے اشعار کے ساتھ اپنے اشعار بھی اسی مضمون کے نقل کیے ہیں، گاہ بگاہ اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔

ید بیضا کے مقدمے میں آزاد بلگرامی نے پہلے فارسی شاعر اور موزوں کلمات کے متعلق جامع اور مفصل بحث کی ہے، تاریخی کتابوں، تذکروں اور دیگر ماخذ کی مدد سے مع اسناد کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اولین فارسی شاعر کون تھا اور اولین موزوں کلمات کیا تھے، آزاد بلگرامی کی رائے جدید نقادان سخن کی آرا سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتی ہے، مثلاً رضازادہ شفق (۷) اور علامہ عبدالوہاب قزوینی (۸) نے بھی انہیں شعرا کو اولین فارسی شعرا قرار دیا ہے، جن کا نام آزاد بلگرامی نے لیا ہے اور ان شعرا کے وہی اشعار بھی نقل کیے ہیں جن کو آزاد نے نقل کیا تھا، اس سے آزاد کے تذکرے کی اہمیت اور افادیت کا پتا چلتا ہے۔

تذکرہ ید بیضا ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کے قلمی نسخے ہندوستان اور دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ذیل میں ہم ان نسخوں کی تفصیل درج کرتے ہیں:

۱- مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں ید بیضا کے تین قلمی نسخے موجود ہیں جو مختلف زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۱) احسن کلکشن ۷/۹۲۰ فارسیہ

تالیف ۱۱۴۸، کاتب سید محمد بلگرامی ہیں، یہ نسخہ اصل نسخے سے نقل شدہ ہے اور شاہ جہان آباد میں ۱۱۵۹ھ میں نقل ہوا ہے، یہ نسخہ مکمل ہے، خط نستعلیق ہے، سائز ۶×۵ x ۹، سطر ۲۰، اوراق ۱۶۷ ہیں، گو نسخہ کرم خوردہ ہے اور صفحات بھی زرد و خستہ ہیں جن پر بٹر پیپر چپکا ہوا ہے مگر قابل خواندنی ہے، پہلے صفحہ پر مہر بیضوی ''گدا بادشاہ شاہ نامش گدا'' ہے، شعرا کے تخلص سرخ روشنائی سے تحریر ہیں، اس کے علاوہ وقفہ کا نشان «،،» سرخ روشنائی سے اور اشعار کا انتخاب نقل کرنے سے پہلے ''منہ'' سرخ روشنائی سے تحریر ہے، حاشیے میں عبارت کی فروگزاشت تحریر ہے۔

مقدمہ کے بعد اسامی شعرا کے تخلص بالترتیب الف بای کے نقل ہیں، حرف الالف کا آغاز
افضل الدین کاشانی کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ آزاد بلگرامی نے اپنے ذکر پر کیا ہے، کل ایک سو
چونتیس (۱۳۴) شعرا کا ذکر ہے، حرف البای کا آغاز بیدار رازی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور
خاتمہ بیرنگ مرزا محمد کے ذکر پر ہوتا ہے، کل اٹھاون (۵۸) شعرا کا تذکرہ ہے، حرف التای کا آغاز
تصنیفی خوانسادی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ تمنا مرزا محمد علی کے ذکر پر ہوتا ہے، کل تئیس
(۲۳) شعرا کا ذکر ہے، حرف الثای کا آغاز ثنائی خواجہ حسین مشہدی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور
خاتمہ ثابت میر محمد افضل الہ آبادی کے ذکر پر ہوتا ہے، کل پانچ (۵) شعرا کا ذکر ہے، حرف الجیم کا آغاز
جمال الدین محمد بن عبدالرزاق اصفہانی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور جامع کشمیری کے تذکرے پر
خاتمہ ہوتا ہے، کل پچیس (۲۵) شعرا کا ذکر ہے، حرف الحای کا آغاز حجت ناصر خسرو اصفہانی کے
ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ حسرت محمد اشرف کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل چونسٹھ (۶۴) شعرا کا ذکر
ہے، حرف الخای کا آغاز خاقانی شروانی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ خاشع کے ذکر پر ہوتا ہے،
کل ستائیس (۲۷) شعرا کا تذکرہ ہے، حرف الدال کا آغاز درویش دہکی کے تذکرے سے ہوتا ہے
اور خاتمہ دانا کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل سترہ (۱۷) شعرا کا ذکر ہے، حرف الذال کا آغاز ذوالفقار
کے تذکرے سے ہوتا ہے اور ذہنی کاشی کے تذکرے پر خاتمہ ہوتا ہے، کل چار (۴) شعرا کا ذکر ہے،
حرف الراء کا آغاز رودکی سمرقندی کے تذکرے سے ہوتا ہے، خاتمہ روائی اکبر آبادی کے ذکر پر ہوتا
ہے، کل چونسٹھ (۶۴) شعرا کا تذکرہ ہے، حرف الزای کا آغاز زکی شیرازی کے ذکر سے ہوتا ہے
اور خاتمہ زیب النساء بنت عالم گیر بادشاہ کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل پندرہ (۱۵) شعرا کا ذکر ہے
،حرف السین کا آغاز سنائی غزنوی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ سرآمد کشمیری کے ذکر پر ہوتا
ہے، کل تہتر (۷۳) شعرا کا تذکرہ ہے، حرف الشین کا آغاز شطرنجی سمرقندی کے تذکرے سے ہوتا
ہے اور خاتمہ شاعر کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل چھپن (۵۶) شعرا کا ذکر ہے، حرف الصاد کا آغاز
ادیب صابر ترمذی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ ملا صادق تونی سرکانی کے تذکرے پر ہوتا
ہے، کل پینتالیس (۴۵) شعرا کا ذکر ہے، حرف الضاد کا آغاز ضیاء الدین فارسی کے تذکرے سے
ہوتا ہے اور خاتمہ ضمیر میرزا روشن کے ذکر پر ہوتا ہے، کل دس (۱۰) شعرا کا ذکر ہے، حرف الطاء کا آغاز

طغیان کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ طبیعت شیخ سیف الدین کے ذکر پر ہوتا ہے، کل اکتیس (۳۱)
شعرا کا تذکرہ ہے، حرف الظاء کا آغاز ظہیر فاریابی کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ ظہیرا کے ذکر پر ہوتا
ہے، کل آٹھ (۸) شعرا کا تذکرہ ہے، حرف العین کا آغاز عباس مروزی کے تذکرے پر ہوتا ہے اور
خاتمہ عابد خواجہ عبدالرحیم کے ذکر پر ہوتا ہے، کل ستانوے (۹۷) شعرا کا ذکر ہے، حرف الغین کا
آغاز غضائری رازی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ غالب میر جلال الدین کے تذکرے پر ہوتا
ہے، کل چھبیس (۲۶) شعرا کا ذکر ہے، حرف الفای کا آغاز فردوسی طوسی کے تذکرے سے ہوتا ہے
اور خاتمہ فصیح اکبر آبادی کے ذکر پر ہوتا ہے، کل پچپن (۵۵) شعرا کا ذکر ہے، حرف القاف کا آغاز
قطران بریزی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ قانع سیوستانی سید مرتضی کے تذکرے پر ہوتا ہے،
کل سینتیس (۳۷) شعرا کا ذکر ہے، حرف الکاف کا آغاز کمال الدین اسماعیل بن جمال الدین
کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ کرامی کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل چوالیس (۴۴) شعرا کا ذکر
ہے، حرف اللام کا آغاز لطف اللہ نیشاپوری کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ لائق میر محمد مراد کے
تذکرے پر ہوتا ہے، کل آٹھ (۸) شعرا کا ذکر ہے، حرف المیم کا آغاز منجنیک ترمذی کے تذکرے
سے ہوتا ہے اور خاتمہ مشتاق کے ذکر پر ہوتا ہے، کل ایک سو پینتالیس (۱۴۵) شعرا کا ذکر ہے،
حرف النون کا آغاز نظامی گنجوی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ نثار دہلوی کے تذکرے پر ہوتا
ہے، کل چورانوے (۹۴) شعرا کا ذکر ہے، حرف الواؤ کا آغاز وحشی بافقی کے تذکرے سے ہوتا
ہے اور خاتمہ وارد محمد شفیع شاہ جہاں آبادی کے ذکر پر ہوتا ہے، کل بیالیس (۴۲) شعرا کا تذکرہ ہے،
حرف الہای کا آغاز ہمام تبریزی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ ہمت محمد عاشق گورکھپوری
کے تذکرے پر ہوتا ہے، کل ستائیس (۲۷) شعرا کا ذکر ہے، حرف الیای کا آغاز یمین کے تذکرے
سے ہوتا ہے اور خاتمہ میر محمد یوسف کے ذکر پر ہوتا ہے، کل بیس (۲۰) شعرا کا ذکر ہے۔

تذکرے کے آخر میں مصنف آزاد بلگرامی نے اپنی مفصل سوانح لکھی ہے، کل بارہ سو
چوّن (۱۲۵۴) شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔

(ii) شاہ منیر گلکشن، بکس نمبر ۴/۲۔

۱۲۴۵ھ کا مکتوبہ، کاتب کا نام مٹا ہوا ہے، مکمل نسخہ ہے، خط نستعلیق میں تحریر ہے،

اوراق ۲۲۴ ہیں، سطر ۱۵-۱۴ ہیں، کرم خوردہ، صفحات زرد ہیں، سیاہ روشنائی سے تحریر ہے، سرخ روشنائی سے شعرا کے تخلص، وقفہ کا نشان اور مقدمے میں اکثر عبارت کو زندہ و چشم گیر بنانے کے لیے عبارت کے نیچے سرخ روشنائی سے لکیر کھینچی ہوئی ہے، آزاد نے اپنے اشعار نقل کرنے سے پہلے "لمولفہ" سرخ روشنائی سے لکھا ہے، قابل خواندنی نسخہ ہے۔

(iii) سبحان اللہ گلکشن، ضمیمہ ۴۶/۹۲۰، نامکمل نسخہ ہے۔

حرف العین تک شعرا کے نام ہیں، نہایت کرم خوردہ ہے، کسی حد تک قابل خواندنی ہے، بٹر پیپر لگا ہوا ہے، اسامی شعرا کے تخلص سرخ روشنائی سے تحریر ہیں، اشعار سے پہلے "نشان سرخ روشنائی سے اور وقفہ کا نشان" بھی سرخ روشنائی سے تحریر ہیں، فروگذاشت عبارت حاشیہ میں تحریر ہے، اوراق ۲۲۷ ہیں۔

۲- کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ید بیضا کے دو قلمی نسخے موجود ہیں جو تذکرہ "صبح خنداں" کے نام سے موسوم ہیں: (i) ید بیضا نمبر ۱۵۵- خط شکستہ، (ii) ید بیضا نمبر ۱۵۶-۱۲۹۷ھ کا مکتوبہ۔

۳- انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۳۹۶۶، کتابت ۱۱۸۷ھ۔

۴- آقا محمد ابراہیم گرہی یا سمین سندھ، پاکستان کے ذاتی کتب خانے میں ید بیضا کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۵- کتب خانہ شبلی نعمانی، ندوہ لکھنؤ میں "ید بیضا" کا ناقص الآخر نسخہ ہے۔

۶- ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونی ورسٹی میں قلمی نسخہ "تذکرۃ الشعرای فارسی" کے نام سے فہرست مخطوطات فارسی میں موجود ہے۔

۷- بانکی پور پٹنہ میں قلمی نسخہ نمبر ۶۹۱ پر موجود ہے، اوراق ۱۳۰، سطر ۲۱، سائز ۸×۵، ۳/۴ × ۶ ۳/۴ × ۱۰، مکمل نسخہ ہے۔

۸- سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد، فہرست مخطوطات فارسی میں دو نسخے موجود ہیں:

(i) قلمی نسخہ نمبر ۵۰،۵۴۵، اوراق ۴۱۹، سطر ۱۵-۱۱، سائز ۸ × ۱۲۵، کاتب میر رضا حسین ہیں، چودھویں صدی کا مکتوبہ ہے، (ii) قلمی نسخہ نمبر ۵۰،۵۴۶، خط نستعلیق، کتابت ۱۹۰۵ء/ ۱۳۲۳ھ، اوراق ۱۷۷، سطر ۲۵-۱۱، سائز ۸.۲ × ۱۳.۱۔

امروہہ کی پہلی جامع مسجد

از:- جناب انوار صمدانی صاحب☆

امروہہ شمالی ہند میں تقریباً ڈھائی ہزار سال پرانی تاریخی بستی ہے، جہاں اب بھی ایسے تاریخی آثار موجود ہیں جو اس کی تاریخی، ادبی، ثقافتی اور فنی عظمت شان کے شاہد ہیں، امروہہ کے ان قدیم تاریخی آثار میں مسجد کیقباد بھی ہے جو محلہ صدور میں واقع اور امروہہ کی پہلی جامع مسجد ہے۔

مسجد کی قدامت و بنائے تاریخ اور اہمیت: امروہہ کی قدیم تاریخوں تاریخ اصغری اور تاریخ واسطیہ سے اس مسجد کی قدامت کا پتہ چلتا ہے، "اس سے پہلے کوئی عمارت اس شہر میں باقی نہیں"، تاریخ واسطیہ ص ۲۷۶ پر تحریر ہے کہ: "ایک مسجد بہت بڑی اور عالی شان اس محلہ میں واقع ہے، نام اس محلہ کا محلہ جامع مسجد موسوم تھا" اس سے پتا چلتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس کا نام محلہ مسجد جامع (۱)/ جامع مسجد تھا۔

تاریخ امروہہ ص ۲۰ پر موجود ہے: "امروہہ کی قدیم جامع جو اب صدو کی مسجد کے نام سے موسوم ہے" اور ص ۱۰۰ پر لکھا ہے کہ: "مسجد کیقبادی...... جو ابتدا سے امروہہ کی جامع مسجد تھی" ص ۹۳ پر ہے کہ: (یہ) "امروہہ کی قدیم ترین عمارت ہے"۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی "حضرت شیخ صدر الدین محمد یعقوب جہندہ شہید" کے ص ۶۱ پر رقم طراز ہیں کہ "بدایوں کے بعد اتنی قدیم دوسری کوئی مسجد شمالی ہندوستان میں شاید ہی ہو"۔

یہ مسجد سلطان معز الدین ابوالمظفر کیقباد کے حکم پر حاکم (۲) امروہہ عنبر سلطانی (۳) نے

(۱) تاریخ امروہہ، ص ۱۴، طبع اول۔ (۲) تاریخ اصغری، ص ۱۱۱، مولفہ اصغر حسین امروہوی۔ (۳) یہ شخص بہت بارسوخ اور منتظم تھا، تاریخ امروہہ، ص ۲۰، طبع اول۔

☆ محلہ بچدرہ، نزد جنوں والی مسجد، امروہہ۔

ماہ رمضان المبارک ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء میں تعمیر کی اور اس کا نام "مسجد کیقبادی" رکھا۔

ایک عربی کتبہ بہ خط ثلث مسجد کی اندرونی شمالی دیوار پر دو سطور میں آج بھی موجود ہے، اس سے سلطان اور حاکم وقت کا حال معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

"امر ببناء هذه العمارت المسجد المباركة فی عهد دولة السلطان المعظم ظل الله فی العالم معز الدنیا والدین المخصوص بعباد رب العالمین القائم بتائید الرحمان ابو المظفر کیقباد السلطان خلد الله ملکه وسلطانه العبد الضعیف الراجی الی رحمة الربانی عنبر سلطانی فی الغرة من شهر المبارک رمضان سنه ست و ثمانین و ستمائة" ۔(۶۸۶ھ)

اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ مسجد سلطان کیقباد کے عہد کی دو تعمیرات میں سے ایک ہے، سلطان معز الدین کیقباد نے اپنا محل کیلوکھیڑی (دہلی) بہ ذات خود بنوایا تھا اور یہ مسجد اسی کے حکم سے حاکم امروہہ عنبر سلطانی نے امروہہ میں بنوائی، تاریخ اصغری ص ۱۱۱ پر لکھا ہے کہ "معز الدین کیقباد کے وقت میں عنبر...... سلطانی نے بہ حکم بادشاہ سابق الذکر یہاں...... مسجد بنائی"۔

سلطان کیقباد کا دور حکومت صرف دو سال اور چند ماہ رہا، اس کی پیدائش ۶۶۷ھ/ ۱۲۶۸ء، سال جلوس ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء اور انتقال جمادی الآخر ۶۸۹ھ/ ۱۲۹۰ء میں ہوا۔ (آثار الصنادید، ص ۴۶)

برسر شان شاہ جواں بخت زاد — تاج در پاک گہر، کیقباد
کرد چو در شش صد و ہشتاد و شش — برسر خود تاج جد خویش خوش(۱)

۶۸۶ھ (امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ)

مسجد کی شکستگی اور مرمتیں: تاریخ امروہہ ص ۹۴ پر تحریر ہے "جب یہ عمارت کسی صدمہ سے شکستہ ہوگئی تو قطب الدین قناق خاں نے جو اس زمانہ میں امروہہ کے حاکم تھے، اس کی مرمت کرائی"۔

(۱) تاریخ فیروز شاہی (اردو)، ص ۲۱۵ حاشیہ۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں جو مسجد کے جنوبی اور شمالی پایہ پر لکھے ہوئے ہیں:

در عہد عدل خان زمان فلک جناب — کز فیض عدل است او جہاں خلد جاوداں
کان سخاؤ خواجہ دنیا و قطب دین — عالی تبار قافلہ سالار راستاں
از بہر خاص و عام جہان ساخت مسجدے — کز مسجد الحرام دہد در صفا نشاں
زرش بہ روشنی و شرافت چو آفتاب — سقفش بہ سادگی و لطافت چو آسماں
تاریخ ایں خجستہ بنا بر رواق چرخ — کلک قضا نوشت بنائے قناق خاں

۹۶۴ھ

مورخ امروہہ محمود احمد عباسی (۱) قناق خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خواجہ قطب الدین قناق خاں عہد ہمایوں اور ابتدائی عہد اکبری میں امروہہ کا حاکم تھا، اس کے عہد کی امروہہ میں کئی یادگاریں ہیں، جامع مسجد کیقبادی جب شکستہ ہوگئی تو اسی حاکم نے ...... اپنے زمانہ حکومت و ریاست میں پھر تعمیر کرایا تھا"۔

عرصہ دراز کے بعد یہ مسجد دوبارہ شکستہ ہوگئی تو ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۳ء میں مولوی سید محمد میر عدل الحسینیؒ (متوفی ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء) (۲) نے نہ صرف مرمت ہی کرائی بلکہ اس میں دو گنبدوں کا اضافہ بھی کیا، آپ امروہہ کے نامور سنی حنفی عالم دین اور صوفی مشرب بزرگ تھے، آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین حسن الحسینی معروف بہ شاہ ولایتؒ (متوفی ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۸ء) (۳) کی اولاد میں تھے، آخر عمر میں اکبر نے آپ کو بھکر (سندھ) کا گورنر بنادیا تھا، مزار شریف بھکر کے پرانے قلعہ میں ہے، مسجد کی مرمت کے ثبوت کے لیے یہ کتبہ جو مسجد کی اندرونی جنوبی دیوار پر آج بھی کندہ ہے، ملاحظہ ہو:

بہ عہد اکبر غازی جلال دولت دین — مدار ملک و ملل بادشاہ ظل اللہ

(۱) تاریخ امروہہ، ص ۴۵۔ (۲) دربار اکبری اور تذکرہ علمائے ہند۔ (۳) تذکرۃ الکرام از محمود احمد عباسی (متوفی ۱۹۷۴ء، پاکستان)، ص ۱۵۔

زمانہ خادم درگاہ اوست بے تکلیف — ستارہ بندۂ میزان اوست بے اکراہ
بنا نمود در امروہہ مسجدِ جامع — معز دینِ محمد امیر خلق پناہ
سپہر مرتبہ سید محمد عادل — کہ وصف او شدہ اوراد خلق بیگہ وگاہ
دلم چونکتہ تاریخش از خرد پُرسید — جواب داد رواں مصرعے خوش ودل خواہ
مگو ز ہائے اخیر و بگوئے تاریخش — بنائے میر عدالت پناہ عالی جاہ

قائلہ وکاتبہ عارفی ۹۸۱ھ

یہ اشعار عارفی نامی کسی شاعر کے ہیں اور وہی ان کے کاتب بھی ہیں۔

تیسری مرتبہ یہ مسجد پھر شکستہ ہوئی تو مسلمانانِ امروہہ نے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء میں ایک پمفلٹ جاری کیا جس کے ذریعہ مسجد کی مرمت کے لیے چندہ جمع کیا گیا، اس پر تقریباً نوے (۹۰) افراد کے دستخط تھے، چند اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- میر اسد اللہ خاں عرف میر کلو الحسینی نقش بندی حنفی (بانی مسجد اور مدرسہ میر اسد اللہ خاں عرف میر کلو محلہ گدری معروف بہ حوض والی مسجد)، ۲- علی اعظم خاں، ۳- تاج محمود خاں (دانش مندان)، ۴- شجاعت علی (گدری)، ۵- محمد سلامت علی، ۶- محمد کفایت، ۷- محمد امانت (شفاعت پوتہ)، ۸- علی حسن خاں (دربار کلاں)، ۹- خیر اللہ خاں (نخشی)، ۱۰- مولوی محمد سعید عباسی، ۱۱- مولوی غلام مصطفی عباسی، ۱۲- مولوی نواز محمد عباسی، ۱۳- ابوالمکارم عباسی، ۱۴- نظام الدین عباسی (ملانہ) وغیرہ، مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں تاریخ امروہہ، ص ۹۵-۹۶ طبع اول۔

قبل ازیں نواب رام پور سر علی محمد خاں (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء - ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء) نے اس قدیم ترین مسجد کی مرمت کرائی جیسا کہ "تاریخ کتاب خانہ رضا" از حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری، ص ۷۹-۸۰ پر تحریر ہے کہ "آثار قدیمہ کی نگہداشت کا بھی یہ پاس ولحاظ تھا کہ امروہہ کی سدو والی (۱) مسجد بنائی (۲) تو معز الدین کیقباد نے مگر اس کی مرمت کا فخر نواب غفران مآب

(۱) صحیح تلفظ صدو ہے۔ (۲) یہ مسجد سلطان کیقباد نے بذات خود نہیں بنائی بلکہ حاکم امروہہ عنبر سلطانی کو حکم دیا تھا، دیکھیے تاریخ اصغری، ص ۱۱۱۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں جو مسجد کے جنوبی اور شمالی پایہ پر لکھے ہوئے ہیں:

در عہد عدل خان زمان فلک جناب — کز فیض عدل است او جہاں خلد جاوداں
کان سخاؤ خواجہ دنیا و قطب دین — عالی تبار قافلہ سالار راستاں
از بہر خاص و عام جہان ساخت مسجدے — کز مسجد الحرام دہد در صفا نشاں
فرشش بہ روشنی و شرافت چو آفتاب — سقفش بہ سادگی و لطافت چو آسماں
تاریخ ایں خجستہ بنا بر رواق چرخ — کلک قضا نوشت بنائے قناق خاں

۹۶۴ھ

مورخ امروہہ محمود احمد عباسی (۱) قناق خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خواجہ قطب الدین قناق خاں عہد ہمایوں اور ابتدائی عہد اکبری میں امروہہ کا حاکم تھا، اس کے عہد کی امروہہ میں کئی یادگاریں ہیں، جامع مسجد کیقبادی جب شکستہ ہوگئی تو اسی حاکم نے ...... اپنے زمانہ حکومت وریاست میں پھر تعمیر کرایا تھا"۔

عرصہ دراز کے بعد یہ مسجد دوبارہ شکستہ ہوگئی تو ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں مولوی سید محمد میر عدل الحسینیؒ (متوفی ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) (۲) نے نہ صرف مرمت ہی کرائی بلکہ اس میں دو گنبدوں کا اضافہ بھی کیا، آپ امروہہ کے نامور سنی حنفی عالم دین اور صوفی مشرب بزرگ تھے، آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین حسن الحسینی معروف بہ شاہ ولایتؒ (متوفی ۷۳۹ھ/۱۳۳۸ء) (۳) کی اولاد میں تھے، آخر عمر میں اکبر نے آپ کو بھکر (سندھ) کا گورنر بنا دیا تھا، مزار شریف بھکر کے پرانے قلعہ میں ہے، مسجد کی مرمت کے ثبوت کے لیے یہ کتبہ جو مسجد کی اندرونی جنوبی دیوار پر آج بھی کندہ ہے، ملاحظہ ہو:

بہ عہد اکبر غازی جلال دولت دین — مدار ملک و ملل بادشاہ ظل اللہ

(۱) تاریخ امروہہ، ص ۴۵۔ (۲) دربار اکبری اور تذکرہ علمائے ہند۔ (۳) تذکرۃ الکرام از محمود احمد عباسی (متوفی ۱۹۷۴ء، پاکستان)، ص ۱۵۔

یہ آیت قرآنی مسجد کے پہلے در کی پیشانی پر کندہ ہے۔

ان تمام کتبات سے امروہہ میں فن خطاطی اور خوش نویسی کی ابتدا پر روشنی پڑتی ہے، نیز اس فن کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، یہ کتبات خطاطی کے اعلا نمونوں میں سے ہیں، مسجد میں داخل ہونے کے لیے ایک خوب صورت اور عالی شان دروازہ موجود ہے، جو بہت ہی دل کش انداز میں بنا ہوا ہے، مسجد کے درمیانی در کے سامنے ایک پرانا درخت لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے ایک گنبد صاف طور پر دکھائی نہیں دیتا ہے، اس مسجد کی آراضی کافی ہے، زیادہ تر آراضی پر لوگوں نے ناجائز قبضہ کر کے مکانات بنا رکھے ہیں۔

یہ مسجد پانچ صدیوں سے زیادہ عبادت خانہ رہی، جہاں پنج وقتہ نماز ہوتی تھی، اس میں خانوادۂ چشتیاں کے چشم و چراغ حضرت شیخ صدر الدین محمد یعقوب جھندہ شہیدؒ بن حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے نماز ادا کی، اس وقت کے علما، فضلا، صوفیہ اور اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بارگاہ ایزدی میں اپنی پیشانیاں اس مسجد میں مس کیں، ان ہی کے دم سے مدرسے میں بھی علم و فضل کا چرچا تھا اور رہا لیکن افسوس مفاد پرست افراد نے اس عظیم الشان مسجد کو ویران کر دیا۔

اب اس میں اللہ اکبر کی صدائیں نہیں گونجتی، قرآن پاک کا ورد سنائی نہیں دیتا، احادیثِ رسولؐ کی آوازیں سنائی نہیں پڑتیں، مدح صحابہؓ نہیں ہوتی، افسوس صد افسوس! صرف اور صرف اس میں پرندوں کی بیٹ و غلاظت اور کوڑے، کچرے کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ویسے ویسے امروہہ کی یہ قدیم ترین عبادت گاہ زمانے کے ہاتھوں اب خود بہ خود شہید ہوتی رہی ہے، یہ مسجد شکستہ حالت میں بالکل ویران ایک کھنڈر نما ٹیلے پر کھڑی ہے!!! ع

اس گھر کو فلک بھی رو رہا ہے !!

اب یہ لاجواب عمارت ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۶ء سے دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوج داری قرق ہے، اس کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے، جس وقت اس کے قرقی وارنٹ آئے تھے، اس وقت تقریباً ۲۰ یا ۲۵ آدمیوں کو مسجد سے گرفتار کیا گیا، اس وقت مسلمان حضرات عبادت الٰہی میں مشغول تھے، پولیس نے نہایت بے رحمی سے گاڑیوں میں بھرا، اس مقدمہ میں امروہہ کے ذی علم و باشعور حضرات فریقین مقدمہ تھے اور ہیں، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- جناب مہتاب الدین ہاشمی بن ریاض الدین عباسی (ساکن صدو) متوفی ۲؍مئی ۱۹۸۱ء۔

۲- جناب جمیل احمد بن امیر احمد (ساکن صدو) (حیات)۔

۳- جناب مولوی سید محمد عرف بنے میاں بن مولوی احمد حسن محدث امروہہ (ساکن ملانہ) متوفی ۵؍نومبر ۱۹۷۹ء۔

۴- جناب محمد شفیع عرف استاد تولا بن عبد اللہ مرحوم ساکن صدو۔

۵- جناب توفیق احمد قادری چشتی ماہر نوادرات اور نوادر فروش (ساکن بچدرہ) پیدائش ۱۹۴۱ء (حیات)۔

اب جناب توفیق احمد قادری چشتی ہی اس مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر حضرات میں حکیم صیانت اللہ اور جناب سید محمد میاں مرحومین بھی شامل رہے۔

حکومت ہند محکمۂ آثار قدیمہ سے درخواست: شمالی ہندوستان میں یہ مسجد عہد وسطیٰ (سلطانی عہد) کی قدیم ترین یادگار رہے، بلکہ بدایوں کے بعد اتنی قدیم مسجد شمالی ہند میں نہیں ہے، سلطان معز الدین کیقباد کے عہد کی صرف دو تعمیرات میں سے ایک یہ مسجد سرزمین امروہہ (اتر پردیش میں واقع ہے، اس لیے حکومت ہند محکمہ آثار قدیمہ سے درخواست ہے کہ اس تاریخی عمارت کے تحفظ کے لیے اس کا اندراج آثار قدیمہ میں کر کے اپنا بورڈ اطلاع خاص و عام لگائے، تاکہ اس قدیم ترین انڈین آرکیٹیکچر کی حفاظت ہو جائے، اس وقت یہ عمارت خاصی نازک حالت میں ہے۔

مآخذ

(۱) تاریخ امروہہ، مولفہ محمود احمد عباسی، متوفی ۱۹۷۴ء (پاکستان)، مطبوعہ ۱۹۳۰ء۔ (۲) تذکرۃ الکرام، مولفہ محمد احمد عباسی، متوفی ۱۹۷۴ء (پاکستان)۔ (۳) تاریخ اصغری، مصنف سید اصغر حسین، متوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء غالباً۔ (۴) نخبۃ التواریخ (فارسی)، مصنف مولوی آل حسن مودودی نخشبی، متوفی ۱۸۸۸ء۔ (۵) تواریخ واسطیہ، مصنف رحیم بخش، امروہہ۔ (۶) پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں از ڈاکٹر میمن عبد المجید سندھی۔ (۷) حضرت شیخ صدر الدین محمد یعقوب "جھندہ شہید" از پروفیسر نثار احمد فاروقی چشتی۔ (۸) آثار الصنادید از سر سید احمد خاں متوفی ۱۸۹۸ء، مطبوعہ ۱۹۶۵ء۔ (۹) ڈسٹرکٹ گزیٹر اتر پردیش مراد آباد (انگریزی) از شری متی ایشا بستی جوشی۔

مدرسہ کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا...... ۱۱۳۹ھ تک اس مدرسہ میں علما کا افادۂ درس جاری رہا، مدرسہ کے غالباً آخری مدرس حاجی مولوی محمد امین بن مولوی محمد عیسیٰ متوطن صوبہ بہار کے انتقال کے بعد اس مدرسہ کی تعلیمی حالت اچھی نہیں رہی''۔

سبب ویرانگی: یہ منقش مسجد پانچ سو سال تک بارونق آباد و شاداب رہی اور اسی سے ملحق مدرسہ بھی علم وادب کا گہوارہ رہا، اس کے ویرانگی کی سب سے اہم وجہ قصہ شیخ صدو ہے، یہ قصہ بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر سنین میں شروع ہوا۔ (تاریخ امروہہ، ص ۱۳۳، طبع اول)

مفاد پرست اور دولت پسند لوگوں نے اس قصہ کو بام عروج پر پہنچایا، امروہہ کے تمام مورخین نے اس قصہ کو نقل کیا اور آج بھی مشہور ہے کہ اس میں ایک شخص بنام شیخ صدو موذن تھے، ان کو تعویذ گنڈوں کا شوق تھا، اسی شوق کی بنا پر ان کے قبضے میں ایک مؤکل زین خان تھا، ایک روز زین خان نے جنابت کی حالت میں پاکر شیخ صاحب کو مار ڈالا، اس وجہ سے ان کی روح اس عالم آب وگل میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی، یہی روح خوب صورت عورتوں پر آتی تھی، وہ مستورات اور دیگر لوگ شیخ صاحب کے نام پر چڑھاوے دینے کے لیے اس مسجد میں آیا کرتے تھے اور اس میں بجائے عبادات الٰہی کے میلے ٹھیلے ہونے لگے، چڑھاوے کی رقم اتنی کثیر ہوتی تھی کہ بعض خاندان کا گزر بسر پوری طرح اسی آمدنی پر ہونے لگا (تاریخ امروہہ از محمود احمد عباسی، ص ۱۳۵-۱۳۶)، اس طرح اس عبادت خانے میں واہیات اور توہم پرستی ہونے لگی، ایک ہندی کہاوت کے پیش نظر ''جس کو ملے یوں وہ کھیتی کرے کیوں'' کے مصداق لوگوں نے ایک بزرگ کے حالات کو گم نامی کے گڑھے میں پہنچادیے اور شیخ صدرالدین محمد یعقوب 'جھندہ شہید' کو شیخ صدو اور جھنڈا شہید کردیا۔

حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب ''جھندہ شہید'' حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے پانچویں بیٹے تھے، محمد احمد عباسی تاریخ امروہہ، ص ۱۳۴ پر شیخ صدو اور آپ کی والدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''امروہہ کی قدیم جامع مسجد کیقبادی کا ایک موذن شیخ صدرالدین عرف شیخ صدو تھا...... باپ کا نام تو معلوم نہیں، ماں کا نام البتہ آسیا یا عائشہ مشہور ہے''۔

حضرت بابا فریدؒ کے پانچ فرزند ارجمند اور چار صاحب زادیاں تھیں، چوتھی صاحب زادی

کے متعلق علمی و ادبی دنیا کے معروف اسکالر علامہ نثار احمد فاروقی ''حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب جھندہ شہید کے ص ۳۳ پر لکھتے ہیں کہ:

''(۴) بی بی عائشہ: حضرت بابا صاحب کی ایک صاحب زادی حضرت بی بی عائشہ کا مزار خلد آباد (نزد اورنگ آباد، مہاراشٹر) میں بھی بتایا جاتا ہے''۔

اس طرح معلوم ہو کہ عائشہؒ حضرت یعقوبؒ کی والدہ نہیں بلکہ بہن تھیں، ہوسکتا ہے کہ زمانے کے حادثات نے عائشہ کو بھی شیخ صدرالدین کی طرح آسیا بنادیا ہو۔

حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوبؒ کو غارت گروں نے (۱) شہید کرکے آپ کی نعش مبارکہ کو ایک ٹیلے پر بے کفن گڑھے میں دبا دیا، آپ کا مزار محلہ جھندہ (جھنڈا) شہید میں واقع ہے، آپ کا ذکر خیر ہندوستان کی معتبر تواریخ وتذکروں میں موجود ہے، نیز آپ کے مکمل حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب جھندہ شہید'' مصنفہ علامہ نثار احمد فاروقی مرحوم، آپ کی اس تحقیق کو ہندوستان کے مشہور ومعروف محققین نے تسلیم کیا ہے، نیز اس تصنیف کی صداقت کے لیے ملاحظہ ہو ''پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں از ڈاکٹر عبدالمجید سندھی مطبوعہ ۱۹۹۴ء (پاکستان) ص ۲۴۹ کا یہ اقتباس:

''شیخ یعقوب: بابا فرید کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے، امروہہ میں جاکر متوطن ہوگئے تھے اور وہیں وفات پائی اور مدفون ہوگئے''۔

مسجد کی کیفیت اور موجودہ حالت: اس مسجد کی تعمیر تقریباً سات سو سال کا زمانہ گزر چکا ہے، یہ مسجد بہت خوب صورت اور دل کش بنی ہوئی ہے، اس کے گنبدوں، دروں اور دیواروں پر گل کاری کے نمونے موجود ہیں، اس کی عمارت گچھ (چونے) اور سرخی سے تعمیر کی گئی ہے، ملک عنبر سلطانی نے مسجد کے در، دیوار اور اس کی پیشانی پر قرآنی آیات بہ خط ثلث کندہ کرائیں۔

''من امن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوٰۃ وا تی الزکوۃ (ط)''

یہ کتبہ مسجد کے مین گیٹ (Main Gate) کی شمالی دیوار پر نصب ہے۔

''ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اولئک ان یکونوا من المھتدین (ط)''

---

(۱) اخبار الاخیار ترجمہ اردو مطبوعہ ۱۹۹۰ء کے ص ۱۵۷ پر آپ کا سنہ پیدائش اور انتقال کی تاریخ ۶۲۲ھ اور ۶۶۱ھ تحریر ہے۔

مطبوعہ ۱۹۶۸ء۔(۱۰) منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی، متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء۔(۱۱) تاریخ فیروز شاہی (اردو) از ضیاء الدین برنی، متوفی ۷۸۹ھ/۱۲۸۷ء۔(۱۲) دربار اکبری محمد حسین آزاد دہلوی، متوفی ۱۹۱۰ء۔ (۱۳) تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی خاں شوق، متوفی ۱۹۳۳ء۔(۱۴) اخبار الاخیار (اردو) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء۔

فارم IV

(رول نمبر ۸)

نام رسالہ: معارف، اعظم گڈھ

نام پریس: معارف پریس، اعظم گڈھ نام پبلیشر: عبدالمنان ہلالی

مقام اشاعت: دارالمصنفین، اعظم گڈھ قومیت: ہندوستانی

وقفۂ اشاعت: ماہانہ پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نام پرنٹر: عبدالمنان ہلالی اڈیٹر: اشتیاق احمد ظلی

قومیت: ہندوستانی قومیت: ہندوستانی

پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبدالمنان ہلالی

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ
ہاں یاد تمہاری آتی ہے

از:- (مولانا) عبدالعلی فاروقی صاحب ☆

بعض لوگ دل کے قریب ہوتے ہیں مگر ظاہری علائق کی کمی کی وجہ سے دل کی دھڑکنیں بھی ان کی قربت کا احساس دلانے سے قاصر رہتی ہیں، "معارف" کے مدیر اور "دارالمصنفین" اعظم گڈھ کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی اچانک خبر وفات کا علم اخبارات کے ذریعہ ہوا تو دل کو کچھ عجیب انداز کی بے چینی ہوئی، خیال ہوا کہ "حادثاتی موت" کی خبر سے یہ بے چینی ہوگی؟ مگر پھر رہ رہ کے ایک کسک سی ہوتی ہی رہی، "البدر" کے تیار شمارہ میں دوسرے دو عالموں مولانا محمد افتخار الحق صاحبؒ مہتمم مدرسہ نور العلوم بہرائچ اور مولانا حکیم نظام الحق صاحبؒ مہتمم ادارہ محمودیہ محمدی کے ساتھ مولانا اصلاحیؒ کے لیے بھی چند سطریں لکھ دی گئیں اور "البدر" کا یہ فروری ۲۰۰۸ء کا شمارہ شائع بھی ہوگیا مگر دل کا یہ عجیب تقاضا ہے کہ مولانا مرحوم کے بارے میں کچھ اور لکھا جائے، شاید یہ اس لیے کہ مولانا مرحوم دل سے قریب ضرور رہے مگر اس کا احساس اب ہوا جب کہ وہ ہماری اس فانی دنیا سے کوچ کر کے اپنے رب سے جا ملے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ایک مشکل یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے کچھ بہت زیادہ ظاہری قربت نہیں رہی، "معارف" کے علاوہ ان کے دیگر علمی افادات سے مستفید ہونے کی نوبت بھی نہیں آئی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ جون ۱۹۷۷ء سے "البدر" کا اجرا ہوا اور "معارف" کے ذمہ داروں نے اس سے "معارف" کا تبادلہ منظور کرلیا، "معارف" ایک خاص ذوق و مشن کا علمی رسالہ ہے اور اس کی تمام تحریریں ہر ایک کی "پہنچ" کی نہیں ہوتیں، تاہم اس خوش گوار حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ

☆مدیر اعلا ماہنامہ "البدر" کاکوری، لکھنؤ۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی ادارت سے پہلے اور ان کے دور ادارت میں بھی ''معارف'' کے صفحات میں شائع ہونے والی ان کی تحریریں میری ''پہنچ'' میں رہیں اور ان کی تحریروں کو میں نے ہمیشہ غور سے پڑھا اور قدر کی نگاہوں سے پڑھا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مولانا مرحوم کی ایک تحریر پر میں نے ان سے باقاعدہ جرح کی اور اب ان کی اس ''بڑائی'' کو کیوں کر فراموش کروں کہ اپنی اس تحریر کی ''بنیادی خامی'' کا انہوں نے کھلے دل سے میرے سامنے اعتراف بھی کرلیا؟ تاریخ اور سنہ تو یاد نہیں، ۲۰-۲۲ برس پہلے کی بات ہوگی کہ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی ایک پرانی اور نایاب کتاب '' تنبیه الحائرین '' نئے قالب اور نئے نام ''شیعہ اور قرآن'' کے ساتھ شائع ہوئی تو میں نے اسے ''معارف'' کو بھی تبصرہ کے لیے بھجوادیا، کئی ماہ گزرنے اور تقاضا کرنے کے بعد مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ مرحوم کے قلم سے ''معارف'' میں ایک سرسری سا تبصرہ آیا جس میں نفس مضامین کے بجائے کتاب کے نام اور اس کے موضوع پر تنقید کرتے ہوئے اس کی اشاعت کو نامناسب گردانا گیا اور دیگر بہت سے ''صاحبان فضل وکمال'' کی طرح اس موضوع سے ''وحشت'' کا اظہار کرتے ہوئے اس سے گریز کی تلقین کی گئی تھی۔

اتفاق سے یہ تبصرہ شائع ہونے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد جامعہ فاروقیہ، صبرحد جون پور کے ایک جلسہ میں مولانا اصلاحی اور سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب (جو اس وقت ''معارف'' کے مدیر اور دارالمصنفین کے ناظم تھے) سے ایک ساتھ ملاقات ہوگئی اور جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم تینوں کا قیام بھی ایک ہی جگہ ہوا، اگرچہ میری اپنے ان دونوں بڑوں سے پہلی ملاقات تھی لیکن جس گرم جوشی اور اپنائیت کا ان دونوں حضرات نے مظاہرہ کیا اور خاندانی بزرگوں کے حوالوں سے جو شفقت عطا کی اس سے حوصلہ پاکر میں نے مولانا اصلاحی مرحوم سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یوں تو مبصر کا قلم آزاد ہوتا ہے اور اس پر قید لگانا خلاف دیانت بھی ہے لیکن آپ کا تبصرہ ''معارف'' کے شایان شان نہیں ہے'' مولانا نے پہلے تو معاملہ کو ہلکے پھلکے انداز میں رفع دفع کرنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اس کتاب کے مضامین کے کچھ حوالے پیش کرنے کے بعد ان سے یہ دریافت کرلیا کہ ''تبصرہ کرنے سے پہلے آپ نے پوری کتاب پڑھی بھی تھی؟'' تو ان کے ضمیر کی شرافت ابھر کر سامنے آگئی اور یہی وہ مرحلہ تھا جب انہوں نے اپنی

''بڑائی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقرار کرلیا کہ ''واقعی یہ میری غلطی ہے کہ پوری کتاب مطالعہ کیے بغیر ہی میں نے اس پر رواں تبصرہ لکھ دیا''، باتیں پھر اس کے بعد بھی بہت دیر تک اور بہت دور تک ہوتی رہیں اور شاید اس شب ہم لوگوں نے ''سونے کی رسم'' دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ادا کی ہوگی لیکن مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا وہ ''بڑا پن'' اور پھر صبح رخصت ہوتے وقت ہر دو حضرات کا پورے نشاط کے ساتھ اس ملاقات کو ''یادگاری'' قرار دیتے ہوئے بہ اصرار مجھے ''دارالمصنفین'' آنے کی دعوت دینا بلکہ سید صباح الدین مرحوم کا یہاں تک کہہ دینا کہ ''آپ کی دل چسپ و معلوماتی گفتگو کی یہ پہلی قسط تھی جس کی تکمیل انشاء اللہ دارالمصنفین میں ہوگی'' میرے لیے ناقابل فراموش ہے اور غالباً یہی وہ بھولی بسری کہانی ہے جو مولانا ضیاء الدین مرحوم کی وفات کے بعد ان کی یاد تازہ کرا رہی ہے؟ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں دارالمصنفین گیا مگر اس وقت جب وہاں مجھے ''خوش آمدید'' کہنے اور متوقع طور پر مجھ سے صبرحد میں ہوئی گفتگو کی دوسری قسط کا حق ادا کرنے کے لیے سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب وہاں موجود نہ تھے، وہ اس عالم فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت کرچکے تھے اور ان سے صبرحد میں ہوئی پہلی ملاقات ہی اس دنیا کی آخری ملاقات بھی بن چکی تھی، البتہ مولانا ضیاء الدین صاحبؒ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ''بڑے پن'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنی محبتوں سے نوازا کہ مجھے لگا کہ جسے میں اپنے ''دونوں داعیوں'' کے سامنے ہوں، مولانا اصلاحیؒ سے صبرحد میں ایک مرتبہ پھر ملاقات ہونا یاد ہے لیکن یہ ملاقات اس لیے بہت رواروی کی رہی کہ مجھے اپنی تقریر کے بعد اسی وقت شاہ گنج واپس آنا تھا۔

ان تین کے سوا چوتھی ملاقات مجھے یاد نہیں ہے لیکن تین ہی یاد رہ جانے والی ملاقاتوں نے ان کی سادگی، بے ریائی اور عالمانہ وقار کے ان مٹ نقوش قائم کردیے اور آج جب وہ ہماری اس دنیا سے رخصت ہوچکے تو دیگر باتوں کے ساتھ ان کے اپنے ادارہ ''دارالمصنفین'' کا بھی خیال آرہا ہے جس کے مقاصد کی تکمیل اور اس کے کام کو فروغ دینے میں انہوں نے پوری یک سوئی اور وفاداری کے ساتھ اس طرح اپنی عمر عزیز لگائی کہ ادارہ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے شناخت بن گئے تھے، یوں تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ اپنے دین کا کام لینے کے

لیے کسی شخصیت کا ہرگز محتاج نہیں، تاہم مولانا سے پہلے تک ادارہ کی صف اول میں ایسے افراد نمایاں رہے کہ ایک کے بعد دوسرے کی طرف جانشینی کے لیے بے ساختہ نگاہیں اٹھ جایا کرتی تھیں، اسی تناظر میں اپنی محدود معلومات کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب مولانا مرحوم کی جانشینی بھی ارباب حل وعقد کے لیے غالباً ایک مسئلہ ہوگی، وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ میری یہ تحریر مولانا اصلاحی مرحوم کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے دل کے تقاضے کو پورا کرنے یا یوں کہہ لیجیے کہ مولانا مرحوم کے الطاف کریمانہ کا قرض ادا کرنے کے لیے ہے، اس لیے اس میں نہ مولانا کے علمی مقام کی بات ہے نہ ہی ان کے طرز نگارش کی، ان موضوعات پر تو وہ لوگ لکھیں گے جن کا حق ہے اور جنہیں مولانا مرحوم کی شخصیت اور ان کے علمی کاموں سے واسطہ رہا ہے، البتہ اپنے سرسری اور محدود مطالعہ کی روشنی میں مولانا کی انشاپردازی کی اس صفت کا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ خشک اور مشکل موضوعات کو بھی اپنی سہل وبے تصنع نثر کے ذریعہ دل چسپ بنا کر اپنے قاری کو اس کے مطالعہ پر آمادہ کرلینے کا فن جانتے تھے، میں نے ان کی وفات کے بعد ''معارف'' کے کئی شمارے نکالے اور بہ طور خاص ان کی پرانی تحریریں پڑھ کر ان کی یاد تازہ کی تو غالباً اس میں ان کے دل سے قریب ہونے سے کم دخل اس بات کو نہ تھا کہ ان کی تحریریں مجھ جیسے بے بضاعت لوگوں کی بھی سمجھ میں آتی تھیں، مجھے یہ بھی دعویٰ نہیں کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی شخصیت ''سراپا خیر'' تھی اور ان کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی شکایت کا حق نہ تھا، ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے شاکی ہونے میں حق بہ جانب ہو؟ تاہم فرمان نبوی کے مطابق اب ان کے اور ان سے زیادہ اپنے بھلے میں یہی ہے کہ انہیں بھلائی اور خیر کے ساتھ ہی یاد کیا جائے۔

حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کاملہ فرما کر ان کے ساتھ اپنے گھر میں اپنے شایان رحمت معاملہ فرمائے۔ (آمین)

☆

آہ! مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

از:- جناب فاخر جلال پوری صاحب☆

حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ اللہ کو پیارے ہوگئے، یہ خبر سن کر جی دھک سے ہوگیا، مرضی مولا یہی ٹھہری اس میں کسے چارہ، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کیا گئے، دبستان شبلی کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ٹوٹ گئی، گویا دارالمصنفین کے نصف صدی کی ایک روشن تاریخ آج ہم سے رخصت ہوگئی، مرحوم نے مولانا عبدالسلام ندویؒ کی آنکھیں دیکھی تھیں، شاہ معین الدین ندویؒ کی صحبت ومعیت سے استفاضہ کیا تھا اور سید صباح الدین عبدالرحمان مغفور کی علمی بصیرتوں سے اپنے اندرون کو منور کیا تھا، غرض مولانا اس حیثیت سے خوش نصیب تھے کہ دارالمصنفین کے شب وروز کے ایک ایک لمحے کو چشید وکشید کر کے اپنی شخصیت میں جذب کرلیا تھا، وہی عمل ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کا آئینہ خانہ تھی۔

مولانا حد درجہ منکسر المزاج، وضع دار، صوفی صفت، خلیق ونرم خو، ٹھہری ہوئی گفتگو میں وہ لہجے کی حلاوت، غرض مولانا کی کن کن خوبیوں کو گنایا جائے، علمی اعتبار سے وہ دین وادب کے علوم کے ایک مرقع تھے، ان کے خاموش خاموش انداز واطوار میں علم کا ایک سمندر موج زن رہتا تھا، مولانا کی واقعی یہ ممتازانہ صفات تھی کہ وہ آفاق میں نہیں آفاق ان میں گم تھا، ان کے دم سے دارالمصنفین کے درودیوار اور اس کی فضاؤں میں توکلت علی اللہ کی جلوہ گری اور اصول وضوابط کی شیشہ گری جو کل تھی وہی آج بھی تھی، مولانا کی ذات جگر لالہ میں جس سے ٹھنڈک پڑ جائے وہ

☆جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر۔ (یوپی)

شبنم تھی اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان بھی تھی، مراد یہ کہ حق گوئی وبے باکی ان کا صحافتی نصب العین تھا جس کا اندازہ "معارف" کے شذرات سے ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ پر چاہے وہ ملکی ہوں یا بین الاقوامی سب پر کھل کر دیانت داری کے ساتھ اظہار خیال فرماتے تھے، اس میں کسی مصلحت یا ابن الوقتی کا دخل نہیں ہوتا تھا اور دوسری طرف روشن خیالی اور وسیع النظری کا یہ عالم کہ کسی بھی مسلک یا مکتبۂ فکر کے حقائق کو جو علمی اعتبار سے معتبر اور مستند ہیں اس کی پذیرائی کرکے ماہنامہ "معارف" میں شریک اشاعت فرماتے تھے، مولانا کا علم جتنا وسیع وبیدار تھا مولانا اسی قدر بے نیازانہ وقلندرانہ زیست کرتے رہے۔

آج کل دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ روحانی مراکز ہوں یا دینی درس گاہیں یا علم وآگہی کی دانش گاہیں، الا ماشاء اللہ ہر جگہ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ مادیت کے تار و پود کم وبیش بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور دنیاداری کی سبزہ کاری کا عمل جاری وساری ہے مگر قربان جائیے دارالمصنفین کی اس شان دار تاریخ وروایت پر کہ جانے کن سعید روحوں کی دعائے سحر گاہی کا ثمرہ ہے کہ آج ایک صدی ہونے جارہا ہے کہ یہ ادارہ وہی اول اور وہی آخر ہے کہ جہاں دنیاداری اور مادیت کا کوئی شائبہ نہیں۔

شہرت وعظمت اور اپنے وقار ومعیار کے اعتبار سے یہ ادارہ جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے آج اس ابن الوقتی کے دور میں اس کے فرش خاک کو آراستہ وپیراستہ کیا جاسکتا تھا مگر واہ رے استغنا کہ بس وہی ایک ڈگر جس پر علوم ومعارف کے بوریانشینوں کا ایک قافلہ ہے جو آج تک رواں دواں ہے اور جیسے حالات سے یوں مخاطب ہو ع

ہم سے ہے یہ زمانہ زمانے سے ہم نہیں

گذشتہ سال ماہ اگست ۲۰۰۷ء میں کسی دن دارالمصنفین میں حاضری کا موقع نصیب ہوا، مولانا کے شرف نیاز سے بہرہ مند ہوا، تا دیر گفتگو ہوئی، دوران گفتگو میں نے عرض کیا حضرت ماہنامہ "معارف" کا اب نوے سالہ جشن کا پروگرام ہونا چاہیے، اس لیے کہ پوری اردو جمہوریت کی تاریخ میں یہ اعزاز وامتیاز صرف "معارف" کو حاصل ہے کہ اپنی ایک مخصوص روایت اور شناخت کے ساتھ نوے سال کے سفر کو طے کیا ہے، میں نے مزید کہا کہ صد سالہ جشن منانے کا

اگر انتظار کیا جائے تو اس وقت طبعی طور پر ہم آپ جیسے لوگ رہیں کہ نہ رہیں، مولانا اس بات پر مسکرائے اور ہنسے بھی، بات آئی گئی ختم ہوگئی، ہائے کیا معلوم تھا کہ مولانا آج داغ مفارقت دے جائیں گے۔

مولانا کی صحافتی دیانت داری کا یہ واقعہ نہیں بھولتا کہ ابھی گذشتہ سال جنوری ۲۰۰۷ء اور ماہ اگست ۲۰۰۷ء کے "معارف" کے شمارے میں عنوان دو اور مضمون کا پورا متن ایک تھا شائع ہوا، اس کے صاحب مضمون سید اختیار جعفری صاحب تھے، اس کا ایک عنوان ماہ جنوری تھا "صاحبان قلم علمائے اکبر آباد" میں نے مولانا کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک عریضہ لکھا تو اس کے جواب میں مولانا نے مجھے یہ خط تحریر فرمایا تھا:

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی باسمہٖ تعالیٰ
پوسٹ باکس نمبر ۱۹، اعظم گڈھ
۱۴؍اکتوبر ۲۰۰۷ء

مکرمی ومحترمی زید مجدکم
وعلیکم السلام

امید ہے مزاج مبارک بخیر ہوگا، گرامی نامہ موصول ہوا، یادآوری کا شکریہ!

ماہ جنوری ۲۰۰۷ء اور ماہ اگست ۲۰۰۷ء میں ایک ہی مضمون عنوان بدل کر دوبار شائع ہوجانے کی نشان دہی فرماکر آپ نے مجھ پر بڑا اکرم فرمایا، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

سید اختیار جعفری اچھے لکھنے والے ہیں، غالب نامہ اور آج کل وغیرہ میں بھی چھپتے ہیں، اسی حسن ظن اور مضامین کے معارف کے انداز ومعیار کے مطابق ہونے کی بنا پر چند برسوں سے ان کے مضامین معارف میں چھپنے لگے ہیں، مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ اس قسم کا دھوکہ کرتے ہیں، معارف اکتوبر کا لکھا جاچکا تھا ورنہ آپ کا خط اشاعت کے لیے دے دیتا، اب سوچا ہے کہ ان کو آج ہی خط لکھ کر معلوم کروں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں تو فبہا ورنہ آپ کا اور ان کا خط ساتھ ساتھ شائع کیا جائے گا، آپ نے صحیح گرفت کی شکرگزار ہوں، پھر انشاء اللہ ملاقات ہونے پر، محبی ڈاکٹر آفاق فاخری کو سلام مسنون عرض کردیں۔ والسلام

ضیاء الدین

پھر ایک موقع پر میں نے ابھی حال ہی میں صوفیائے کرام کے تذکرے کی ایک معروف کتاب ''بحر ذخار'' مولفہ مولوی وجیہہ الدین لکھنوی جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ یہ کتاب دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہے، اس سلسلے میں مولانا سے جاننے کے لیے ایک خط لکھا، اس کے جواب میں آپ نے یہ خط لکھا جس میں اپنے سفر حج کا بھی ذکر کیا تھا۔

دار المصنفین شبلی اکیڈمی　　باسمہ تعالی
پوسٹ باکس نمبر ۱۹، اعظم گڈھ
13 - 11 - 07

مکرمی و مخدومی

وعلیکم السلام

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، کرم نامہ کئی روز پہلے مل گیا تھا مگر اِدھر اُدھر رکھ دینے سے جواب میں تاخیر ہوگئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

''بحر ذخار'' یہاں تو نہیں ہے، میں نے سنا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں ہے، غالباً اب بہت درہم برہم ہے، اس میں یہ نسخہ ہے لیکن سجادہ نشین صاحب کسی کو یہ دکھاتے نہیں۔

سید اختیار جعفری صاحب کا ابھی کوئی جواب مجھے نہیں ملا۔

ہاں اس سال میں ۱۹؍ نومبر کو بنارس سے انشاء اللہ حج کے لیے روانہ ہوں گا، گھر سے دو ایک روز پہلے ہی جاؤں گا، دعا فرمائیے کہ اللہ تعالی حج مبرور نصیب کرے، آمین۔　والسلام

ضیاء الدین

آہ! آج دار المصنفین کے در و دیوار اُداس اُداس ہیں، آج اس کی مسجد کے منبر و محراب اس مرد حق آگاہ کے سجدوں کے منتظر ہیں جس کا سر اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکا، آج اس کے سبزہ زار خزاں رسیدہ سے لگ رہے ہیں، اس احاطے کے آم و امرود کے پیڑوں سے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی پی کی صدائیں خاموش ہیں کہ اس باغ کا مالی نہیں رہا جس نے نصف صدی اپنی ایک ایک سانس دار المصنفین کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کردی تھی، اِن اللہ لا یضیع اجر المُحسنین، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

صبا جاتا ہوں میں گریاں چمن سے
گلوں کو باغ میں رکھیو تو خنداں

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا انتقال پُرملال

از:- جناب قاضی عبدالاحد ازہری صاحب☆

نہایت حسرت والم کی بات ہے کہ مورخہ ۲؍ فروری ۲۰۰۸ء کو ملک کے نامور عالم دین حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا بنارس کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا، خبروں سے معلوم ہوا کہ مولانا امسال حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے تھے، حج سے واپسی کے بعد اعظم گڈھ سے جہاں وہ سکونت پذیر تھے اپنے رشتہ داروں کی ملاقات کی غرض سے بہ ذریعہ کار سرائے میر تشریف لے جارہے تھے کہ اچانک ان کی کار پلٹ گئی اور حادثہ کا شکار ہوگئی، مرحوم کے ساتھ ان کی اہلیہ صاحبہ بھی تھیں، دونوں سخت زخمی ہوگئے، مرحوم کا زخم کچھ زیادہ ہی کاری تھا، ان کو پہلے اعظم گڈھ کے ہاسپٹل میں داخل کیا گیا لیکن وہاں کامیاب علاج نہ ہونے کی وجہ سے ان کو بنارس کے ایک ہاسپٹل میں داخل کیا گیا جہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جان کو جانِ آفریں کے سپرد کردیا اور شہادت کی موت سے مشرف ہوئے۔

مرحوم بہت ہی نیک اور علم و تحقیق میں رچے اور بسے ہوئے تھے، اب ان کی صفت کے جیسے لوگ خال خال ہی رہ گئے ہیں، ان کا دن رات کا مشغلہ تصنیف اور تالیف اور پڑھنا پڑھانا ہی تھا، گویا یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا، وہ اردو کے اس شعر کا مصداق تھے:

ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن اپنا
کتابوں پر مریں گے ہم ورق ہوگا کفن اپنا

وہ علم و تحقیق کے انٹرنیشنل ادارہ شبلی اکیڈمی المعروف بہ دار المصنفین، اعظم گڈھ کے روح رواں

☆ قاضی شریعت دار القضاء، مالیگاؤں۔

اور ڈائرکٹر تھے اور مشہور دینی وعلمی ماہنامہ "معارف" کے اڈیٹر تھے، یہ وہ ادارہ ہے، جس کی داغ بیل شہرۂ آفاق مصنف ومحقق حضرت مولانا علامہ شبلی نعمانیؒ نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل مستشرقین کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ڈالی تھی اور یہ ادارہ اتنے طویل عرصہ سے بلا کسی تذبذب اور تردد کے آج تک مسلسل اپنے فرض کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے، اس ادارہ کے اولین مدیر وڈائرکٹر تو علامہ شبلی نعمانیؒ ہی رہے، ان کی وفات کے بعد ان کے نامور شاگرد مشہور سیرت نگار، عظیم مصنف اور بلند پایہ ادیب ومحقق حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کی بہترین نیابت کی اور اس ادارہ کو اپنی شبانہ وروز مساعی سے چار چاند لگا دیا اور یہاں سے نکلنے والے ماہنامہ "معارف" کو نہ صرف ملک بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک منفرد معیاری، علمی وتحقیقی ماہنامہ کے روپ میں متعارف کرایا، سید سلیمان ندویؒ کے بعد اس ادارہ کو حضرت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی صاحبؒ جیسا ادیب وخطیب اور عالم ومحقق مل گیا، جنہوں نے اپنے پیش رو دونوں عظیم مصنفین کی وراثت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی فرمایا، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد دارالمصنفین اعظم گڈھ کی تمام ذمہ داریوں کو مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان صاحبؒ نے اپنے کاندھوں پر اٹھالیا اور ادارہ کی شہرت ونام وری میں بال برابر بھی فرق آنے نہیں دیا، انہوں نے بہت زیادہ لکھا اور ادارہ کو بام عروج تک پہنچانے میں انتھک جدوجہد اور محنت سے کام لیا، ان کی زندگی میں عام اصحاب فکر ونظر سوچ رہے تھے کہ سید صباح الدین صاحبؒ کے بعد ادارہ کا خدا ہی حافظ ہوگا مگر ان کی وفات کے بعد ادارہ کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مل گئے، انہوں نے بزرگوں کی اس وراثت کو سینے سے لگایا اور اس امانت کو سر دھڑ کی بازی لگا کر محفوظ رکھا، مولانا اصلاحی صاحب بالکل شبلی وسلیمان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، ان کی تحریروں میں شبلی وسلیمان کی تحریروں کا رنگ جھلکتا تھا، ان کی نگارشات پڑھنے سے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کو پڑھ رہے ہیں، ان کی تحریروں میں وہی ادبیت اور چاشنی ہوتی تھی جو شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں ہوتی تھی اور سطر سطر سے ان کی علمیت اور پختگی ٹپکتی تھی، مولانا اصلاحی صاحب نے کسی بھی طرح ادارہ کے اعتماد اور وزن کو مجروح نہیں ہونے دیا، ان کے

ادارے بھی بڑے خاصہ کی چیز ہوتے تھے، وہ اتنے بڑے تھے، تاہم ہم جیسے لوگوں کی پذیرائی میں بھی بہت ہی پیش پیش رہتے تھے، پچھلے دنوں جب مہذب پور ضلع اعظم گڈھ میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا سولہواں اجلاس منعقد ہوا تو مجھے اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت میں نے ذرا موقع نکال کر جب اعظم گڈھ ان سے ملاقات کے لیے گیا تو مجھے تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑی، انہوں نے اس طرح خاطر مدارات فرمائی جیسے برسوں کی شناسائی ہو، حالاں کہ صرف ایک بار الجامعۃ المحمدیۃ منصورہ، مالیگاؤں میں سالانہ جلسہ کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تھی، اس وقت جب ہم لوگوں نے ان کو معہد ملت، مالیگاؤں میں آنے کی دعوت دی تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کو قبول فرمایا اور تشریف لائے اور معہد ملت کے کاموں کی بڑی تعریف کی تھی، یہ چند گھنٹوں کی ملاقات ان کے قلب پر نقش ہوگئی تھی، وہ بڑے متواضع اور خاکسار تھے اور پرانے اہل علم کے تمام اوصاف ومحاسن ان کی ذات میں جمع تھے، وہ بہت اچھا لکھتے تھے، ہم لوگوں نے تحریر کا انداز ان ہی کی نگارشات سے سیکھا، انہوں نے نہایت بلند تحقیقی اور علمی کتابیں تصنیف کی ہیں جو ان شاء اللہ ان کی یاد کو ہمیشہ قائم رکھیں گی، غرض مرحوم بے انتہا خوبیوں کے مالک تھے، ان کی وفات سے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی اس کے پر کرنے کا انتظام فرمائے گا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اخبار علمیہ

خادم حرمین شریفین شاہ فہد چیپٹر کے زیر نگرانی کام کرنے والے ادارہ اسلامک اسٹڈیز نے قرآن مجید کے الفاظ کی عربی انگریزی لغت تیار کی ہے، اس کے ڈائرکٹر محمد عبدالعلیم کے بیان کے مطابق یہ اہم دینی خدمت ۵ برس میں پایہ تکمیل کو پہنچی، لغت شائع کرنے والے ہالینڈ کے عالمی شہرت یافتہ ادارے سے اس کو شائع کرایا گیا ہے، خاص بات یہ ہے کہ اس میں الفاظ و معانی اور سیاق و سباق کے ساتھ جملوں کی تفہیم کی گئی ہے، قرآن میں وارد تمام مقامات اور شخصیتوں کا تعارف بھی مجملاً کرایا گیا ہے، برطانیہ اور یورپی ملکوں کے علما و محققین اور ان کے کتب خانوں نے اس لغت سے خاص دل چسپی ظاہر کی ہے۔

منیلا شہر کے قیاپو میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں کی صوبائی حکومت نے مسلم طلبا و طالبات کی خواہش کے احترام میں متعدد پرائمری اسکولوں اور ہائی اسکولوں میں عربی زبان و دینیات کی تعلیم کا آغاز کیا ہے اور اب ان کے لیے ۱۸؍اساتذہ کا تقرر ہوا ہے جو ۵؍اسکولوں کے ۱۰۴۰ مسلم طلبا و طالبات کو عربی تعلیم سے آراستہ کریں گے، ان اساتذہ کی تربیت شعبۂ تعلیم انگریزی کے تحت ہوئی ہے، شہر کے میئر الفرڈولم نے بتایا کہ نوجوانوں کو کثیر ثقافتی اقدار سے روشناس کرانا آج کے ماحول میں ضروری ہے۔

ہائر ایجوکیشن فنڈنگ کونسل کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ چار برسوں میں اسلامک اسٹڈیز میں داخلہ کی شرح دیگر مضامین میں داخلہ لینے کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور ۲۰۰۲ء-۲۰۰۶ء میں اس مضمون میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد میں ۱۲ فیصد اضافہ ہوا ہے، انٹر سطح تک اس مضمون میں طالبات کی نمائندگی زیادہ ہے، اس شرح سے برطانوی یونی ورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے مضمون کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آسٹریلیا کی حکومت مذہبی کشیدگی ختم کرنے کے لیے روشن خیال مسلم ماہرین تعلیم اور دیگر شعبہ جات کے سیکولر مسلمانوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پر غور کر رہی ہے، ثقافتی امور

کے پارلیمانی سکریٹری کالاوری فرگساں کے بیان کے مطابق حکومت آسٹریلیا کے عوام کا یہ خیال مٹا دینے کی خواہش مند ہے کہ تمام مسلمان قدامت پسند اور سخت گیر اسلامی نظریات کے حامل ہوتے ہیں، علاقائی اسلامک کونسل کے سربراہ نے فرگسان کی اس تجویز کی پرزور حمایت اور اس کا خیر مقدم کیا ہے کہ حکومت کے مجوزہ منصوبہ میں ممتاز مسلم کھلاڑی، ماہرین تعلیم اور دیگر سماجی کارکنوں کو ۷ رکنی کمیٹی میں شامل کیا جائے گا لیکن اسکائی نیوز آسٹریلیا کی رپورٹ میں فورم برائے آسٹریلیائی اسلامی تعلیمات کے ایک عہدے دار نے اس تجویز کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس تجویز سے چند خطروں کا اندیشہ بھی ہے کیوں کہ ماہرین تعلیم اور کھلاڑیوں کی معلومات اسلام کے اہم مسائل پر اطمینان بخش نہیں ہوتی ہیں۔

فیڈرل ایجنسی آف ایجوکیشن ماسکو کے نائب صدر کا کہنا ہے کہ ہماری بیش تر یونی ورسٹیاں عالمی معیار کی حامل ہیں، بالخصوص انجینیئرنگ، علم التجارت، علم الطبیعیات، اور علم ریاضی کے شعبوں میں ترقیاں شباب پر ہیں، لہذا ہندوستانی طلبا و طالبات اپنی علمی تشنگی بجھانے کی خاطر روس کا رخ کر سکتے ہیں، ہم ہندوستانی طلبا کے تعلیمی مزاج و ماحول اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں گے۔

"Who Speaks for Islam" نامی کتاب جو اسلام اور مسلمانوں کی دہشت گردی سے متعلق متعدد امریکی مصنفین کے جائزہ پر مشتمل ہے میں واضح کیا گیا ہے کہ صرف ۷ فیصد مسلمان اپنا حق حاصل کرنے کے لیے دہشت گردانہ حملوں کی تائید کرتے ہیں لیکن وہ ان حملوں کے مذہبی جواز کے قائل نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اسلام دہشت گردی کی اجازت نہیں دیتا، جو لوگ اس کو مذہب سے جوڑتے ہیں وہ اپنی سیاسی انتہا پسندی کی دکان چمکانا چاہتے ہیں، جائزے کے نتائج امریکی سیاسی رہنماؤں کے اس موقف کے خلاف ہیں جس کے مطابق دہشت گردی کی حمایت کا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ دیتے ہیں تاہم رپورٹ میں مصنفین سنہ اشاعت اور سطح کے نام نہیں دیے گئے ہیں۔

مدینہ منورہ ریسرچ اینڈ اسٹڈیز سنٹر کے محققین سٹیلائٹ یعنی مصنوعی سیاروں کی فراہم کردہ تصویر کی مدد سے ہجرت رسول کا ریکارڈ تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، نیز رسول اللہ

اور یار غار کے سفر ہجرت کی دستاویزات تیار کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیا گیا ہے اور ہجرت رسول کے بارے میں تاریخی تحقیقات سے تیار کردہ اس جائزہ پر یہ سنٹر نظر ثانی بھی کرا رہا ہے جو سعودی جیولوجیکل سروے بورڈ نے تیار کرایا ہے۔

برطانیہ کی ۲۲ ملین آبادی میں ۳ء۵ ملین مسلمان ہیں، وہاں مسلمانوں کی چار بڑی تنظیمیں المجلس الاعلیٰ للمسلمین، مجلس الاسلام، رابطہ مرکز اسلامی اور ترکی اتحاد اسلامی کے نام سے قائم ہیں، ۱۰؍اپریل کو مسلمانوں کی انتظامی مجلس کے نام سے ایک متحدہ تنظیم قائم ہوئی ہے، اس کے ترجمان ایوب اکسل کا بیان ہے کہ جرمن کے تمام مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ حکومت اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب تسلیم کرے اور اسلام کو وہاں کے دوسرے سرکاری مذہب کا درجہ دیا جائے اور تمام صوبوں میں جہاں جہاں مسلمانوں کی خاطر خواہ تعداد ہو مجلس انتظامی کے زیر نگرانی بڑے پیمانے پر اسلامی مدارس قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔

کمپیوٹر آلات تیار کرنے والی کمپنی ہیولٹ پیکارڈ نے ایک چپ چاول کے دانے کے برابر تیار کی ہے جس میں سو صفحات پر مشتمل مواد ضم ہونے کی اہلیت ہے، چپ ۲ سے ۴ مربع ملی میٹر کی ہے، آئندہ اس کے اندر مزید ڈیٹا محفوظ کرنے کی گنجائش کا مسئلہ بھی زیر غور ہے، اس چپ کو کسی بھی مختصر ترین آلہ میں لگایا جاسکتا ہے، آئندہ اس کا استعمال جعلی دوا کے پتہ لگانے اور مریضوں کے امراض کی تشخیص وغیرہ کے لیے کیا جائے گا، ۱۰۰ میگا بائٹ ڈیٹا محفوظ و منتقل کرنے کے لیے اس میں صرف دس سکینڈ کا وقت لگے گا، رپورٹ میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ چپ حقیقی اور ڈیجیٹل دنیاؤں کے درمیان رابطہ کا کام بھی کرے گی، اس کی تیاری میں ابھی کچھ عرصہ اور بھی لگے گا۔

بنگلور مسلم لائبریری میں علوم اسلامیہ یعنی قرآن، حدیث، تفسیر، سیرت، سیر الصحابہ، سیر الاولیا، تصوف، تاریخ عام، تاریخ اسلام، مذاہب عالم پر مشتمل کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، اس کے علاوہ اس میں قرآن و حدیث اور نادر کتابوں کے اردو، انگریزی اور کناڈا زبانوں میں ترجمے بھی موجود ہیں، قدیم رسائل و جرائد اور قیمتی مخطوطات بھی ہیں جن میں بیشتر اردو، فارسی اور دکنی زبانوں میں ہیں، قابل ذکر بات ہے کہ قدامت میں یہ اور دار المصنفین کا کتب خانہ برابر ہے۔

ک۔ص اصلاحی

جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ کی وفات

تعزیتی تجاویز اور خطوط

مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن،

ممبئی۔

۹؍۲؍۲۰۰۸ء

برادرم عمیر صدیق صاحب۔

سلام مسنون۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے انتقال کی خبر مجھے جناب شمیم طارق صاحب سے اسی روز مل گئی تھی، صدمہ تو سب کو ہوا، مجھے زیادہ صدمہ اس لیے ہوا کہ ایک روز پہلے مجھے مولانا کا خط ملا تھا جس میں انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی سمینار کی تاریخ کو آگے بڑھانے کا مشورہ دیا تھا، تاکہ وہ ایک اور پروگرام میں شرکت کرسکیں، خط پانے کے بعد میں نے ان کو فون کیا اور ان کو پوری صورت حال بتائی تو وہ اس سمینار میں شرکت کے لیے رضامند ہوگئے، جو ۱۶؍اور ۱۷؍مارچ ۲۰۰۸ء کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڈھ میں منعقد ہو رہا ہے اور جس کا عنوان "مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر" ہے، مولانا عبدالسلام ندوی پر جو اکتوبر ۲۰۰۱ء میں ممبئی میں سمینار ہوا تھا، اس کے مقالہ نگار کے نام اور عنوانات کا انتخاب بھی مولانا نے ہی کیا تھا، اس دو روزہ سمینار کی کامیابی سے متاثر ہوکر حکیم مختار اصلاحی صاحب نے اور ابوصالح انصاری صاحب نے "اقبال سہیل" پر سمینار کی تحریک دلائی تھی، اس سمینار کا بھی پورا خاکہ مولانا نے ہی تیار کر کے مجھے بھیج دیا تھا، افسوس کہ وہ سمینار ابھی نہیں منعقد کیا جاسکا ہے، اب مولانا بھی نہیں رہے اس لیے قوت میں کمی پا رہا ہوں، مولانا کی شخصیت سے مجھے اس قسم کے پروگرام کرنے

کی تحریک ملتی تھی، میں مولانا کے انتقال کو اپنا ذاتی غم بھی سمجھتا ہوں، آپ کے لیے اور دارالمصنفین کے دیگر احباب کے لیے اور مولانا کے افراد خاندان کے لیے یہ بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

آپ سب کے غم میں برابر کا شریک۔

محمد ہارون

ادارہ احترام انسانیت

جامع مسجد تکیہ، پیتے شاد کوٹ خالصہ،

امرت سر پنجاب، انڈیا

۶/۲/۰۸ء

مکرم و محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر دست شگفتہ ادیب و صاحب قلم مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر "معارف" کے سانحہ ارتحال کی خبر یہاں صاعقہ بن کر گری، تمام علمی و ادبی حلقوں میں ان کے حادثۂ وفات کو ناقابل تلافی نقصان تصور کیا جارہا ہے، مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جابجا تعزیتی نشستوں کا انعقاد جاری ہے، پنجاب کی سرگرم سماجی و ادبی تنظیم "احترام انسانیت" نے بھی ان کی رحلت پر تعزیتی جلسہ منعقد کر کے مرحوم کو ایصال ثواب کیا اور ان کے محاسن و مآثر پر تفصیل سے روشنی ڈالی، احترام انسانیت سے مرحوم کا علمی و فکری ارتباط تھا، وہ اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہتے اور یہاں کے سماجی و علمی کوائف جاننے کے مشتاق رہتے، موصوف کی رحلت کو احترام انسانیت اپنا ذاتی حادثہ تصور کرتی ہے۔

بلا شبہ ان کے انتقال سے فکر و ادب کی دنیا کو خسارے سے دوچار ہونا پڑا ہے، فی الحقیقت وہ مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے سچے جانشین تھے، علمی مجلہ "معارف" ان کی ادارت میں اپنا سفر کامیابی سے طے کر رہا تھا، ان کی رحلت کے بعد اس خلا کا پر ہونا اگر ناممکن نہیں تو

مشکل ضرور ہے، وہ مدت بسیار سے دبستان شبلی کے نقیب اور حدی خواں تھے، بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرما کر جوار رحمت میں جگہ عنایت کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔ (آمین)

نوٹ: مستقبل قریب میں مرحوم پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہو تو مطلع فرمائیں، عنایت ہوگی۔

والسلام

(مولانا) محمد انور قاسمی امرت سری

(جنرل سکریٹری)

گلفشاں، قاصی پور خورد،

گورکھ پور-۲۷۳۰۰۱۔

۳ رفروری ۲۰۰۸ء

عزیزان گرامی محمد عامر، محمد طارق اور سلیم جاوید سلمہم

سلام و رحمت

محترم ضیاء الدینؒ کے اچانک انتقال کی خبر سے دل کو دھچکا لگا، میرے اور ان کے قریبی تعلقات سے یقیناً آپ واقف ہوں گے، میں ایک بہت ہی مخلص دولت سے محروم ہوگیا، مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی تجہیز و تکفین میں شامل نہیں ہو سکا، ایک ہفتہ ہوا میں پختہ زمین پر گر گیا تھا، کئی جگہ چوٹ آئی اور پیر کی ایک ہڈی بھی متاثر ہوئی، ڈاکٹر نے پٹی باندھ دی ہے اور پلنگ پر لٹا دیا ہے، دعا کرتا ہوں کہ اللہ مرحوم کو جنت میں اعلا مقام عطا کرے اور آپ لوگوں کو صبر کی توفیق دے، آپ کی والدہ محترمہ کو صحت دے۔

محمد حامد علی

یہ خط لیٹ کر لکھ رہا ہوں۔

۷/۲/۲۰۰۸ء

ص ب ۸۸۰۰

جدہ-۲۱۴۹۲۔

باسمہ تعالیٰ شانہٗ

ذوالعلم والفضل جناب مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے مزاج گرامی ہمہ وش صحت وعافیت ہو، کل محترم ڈاکٹر آفاق فاخری سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے رحلت کی اطلاع ملی، مزید تفصیل کے لیے میں نے فوراً حافظ نوشاد احمد اعظمی ممبر آل انڈیا حج کمیٹی کو ٹیلی فون کیا، ان سے سڑک کے حادثہ کی اور بنارس اسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے خالق حقیقی سے ملنے کی اطلاع ملی۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات منیٰ مکۃ المکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے مہمان خانہ میں ۱۹۹۲ء میں ہوئی تھی، جب وہ رابطہ کی دعوت پر پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لائے تھے، میں بھی رابطہ کے مقامی ضیف کی حیثیت سے حج کررہا تھا اور پھر بار بار حج کے دوران ملاقات رہی اور عاجز نے بھائی ڈاکٹر عبداللہ عمر لضیف صاحب (اس وقت کے) سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی سے ملاقات کا نظم کیا، جس کی تفصیل مرحوم نے اپنے سفرنامہ حج ''سوئے حرم'' میں لکھی ہے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ ڈاکٹر عبداللہ عمر لضیف صاحب ''دارالمصنفین'' تشریف لائیں، اس سلسلہ میں عاجز نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی لیکن اس کو بعض وجوہ سے عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا، اب مولانا مرحوم جیسے ''فنافی العلم'' بہت خال خال ہیں، میری آخری ملاقات گذشتہ سال (غالباً) نومبر کی پہلی تاریخ کو دارالمصنفین کی مسجد میں ہوئی اور پھر ان کے گھر پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ظہر کی نماز عاجز نے آپ کی امامت میں پڑھی تھی، افسوس ہے کہ آپ سے تعارف واعتراف کا موقع نہیں مل سکا۔

مولانا مرحوم کی سادگی، خاموشی سے علمی کام میں لگے رہنا، ان کا بے پناہ خلوص، امت مسلمہ کا درد، مجھے ہمیشہ یاد آتا رہے گا، امسال مکۃ المکرمہ حج کے موقع پر ملاقات نہیں ہوسکی اس

کا مجھے افسوس ہے، مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے مجھ سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا جو موبائل نمبر بند ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں قائم ہوسکا، ''معارف'' کا علمی معیار ان کے زمانہ میں جوں کا توں باقی رہا، اس میں آپ جیسے رفقا کا بھی بڑا ہاتھ تھا، آج کل کے نامساعد حالات میں جب کہ علمی مذاق بالکل بدل گیا ہے، ایسے ادارہ کا پوری اپنی روایات کے ساتھ قائم رہنا یہ خاص اللہ عزوجل کا فضل ہے، مرحوم کی رحلت کا مجھ پر بڑا اثر ہے، انشاء اللہ ان کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

یہ عاجز دارالمصنفین کے سارے رفقا اور مرحوم کے پس ماندگان سے اپنی دلی تعزیت پیش کرتا ہے، عاجز کو آپ کی تحریرات پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، عاجز کا اندازہ ہے کہ معارف کی ادارت اور دارالمصنفین کی نظامت کے لیے اب آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا نہیں ہے، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی پروفیسر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ عاجز کے قدیم دوستوں میں سے ہیں، ان سے بھی اس مسئلہ میں بات کروں گا، اللہ اس ادارہ کو اپنی شان دار علمی روایات اور مزاج کے ساتھ ہمیشہ قائم ودائم رکھے، اگر ممکن ہو تو رفقا اور مرحوم کے اہل خانہ کی خدمت میں عاجز کا سلام پہنچادیں گے۔

زیادہ حد ادب

فقط والسلام مع الاکرام

ضیاء الدین رحمانی

حیدرآباد-۶۴

۱۹/۲/۰۸ء

بسمہ فعال لما یرید

معزز مجلس ادارت کی خدمت میں ایک قدیم قاری کی طرف سے

سلام مسنون

اور مدیر معارف کے اچانک انتقال پر قلبی تعزیت!

ارحم الراحمین-مرحوم کو فردوس سے سرفراز فرمائے، اہل وعیال پر صبر جمیل انڈیل دے اور معارف کو نعم البدل عطا فرمائے۔

دعا گو ودعا جو

ابن غوری

مدرسہ ارم الاسلامیۃ العلمۃ
تمبور، سیتاپور (یوپی)
۱۴/۲/۰۸ء

باسمہ تعالیٰ

مکرمی قائم مقام ناظم رسکریٹری صاحب، دار المصنفین اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے بڑے بھائی اور میرے مشفق ومربی محترم جناب ڈاکٹر ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے حادثہ فاجعہ کے موقع پر میں کیا تعزیت پیش کروں، میں خود اپنے کو تعزیت کا مستحق سمجھتا ہوں۔

بندہ ادارہ میں مسلسل اسی دن سے تاحضور ایصال ثواب کا اہتمام کر کے اپنے بڑے بھائی مرحوم کو ثواب پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہا ہے اور یہی دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند وبالا مقام عطا فرمائے اور ان کے خلا کو پر فرمائے۔

اخیر میں صرف اتنی درخواست ہے کہ بندہ کے لیے بھی دعا فرمائیں۔

فقط والسلام
طالب دعا
مفتی خبیر ندوی

بسم اللہ

مرکز مطالعات فارسی،
علی گڑھ (الہند)
۲۴/۱/۱۴۲۹ھ

محترم رفقا و کارپردازان دار المصنفین، اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج کے اخبار میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے انتقال کی اندوہ انگیز خبر پڑھی، شدید غم ہوا، اس قحط الرجال کے دور میں مولانا کا دم مغتنم تھا، اللہ تعالیٰ ان کو اعلا علیین میں جگہ عطا فرمائے اور اپنی رحمت ومغفرت کے مخصوص فیصلے سے نوازے اور پس ماندگان کو صبر جمیل اور اس

پر اجر جزیل ارزانی فرمائے۔ (آمین)

علمی دنیا میں ضیاء الدین صاحب کی کمی دیر تک محسوس کی جائے گی اور تمام علم نوازوں اور علم دوستوں کو وہ بار بار یاد رہیں گے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ان کا نعم البدل پیدا فرمائے۔

راقم سطور مولانا مرحوم کے اہل بیت، اہل قرابت اور خانوادۂ دار المصنفین سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے اور ان کے غم میں شریک ہے۔

جویائے خیر
رئیس احمد نعمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۰۱، پیل خانہ
سکنڈ لین، ہوڑہ (مغربی بنگال)
۸ر فروری ۲۰۰۸ء

مکتوب بنام مدیر "معارف" اعظم گڈھ

"دین و دانش کا ایک چراغ بجھ گیا"

محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہفتہ وار "اجالا" (آزاد ہند ایڈیشن) کلکتہ مورخہ ۳ر فروری ۲۰۰۸ء کی اشاعت میں یہ جاں گداز خبر نظر نواز ہوئی کہ حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ڈائرکٹر دار المصنفین اعظم گڈھ و مدیر "معارف" سفر کے دوران ایک کار حادثے میں جاں بحق ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی اہلیہ بھی ہم راہ تھیں جو مجروح ہو کر خطرے سے باہر ہیں، اللہ انہیں جلد از جلد صحت یاب کرے، ان کے اہل وعیال کو صبر واستقامت عطا فرمائے، انہیں بخیر وعافیت رکھے اور مولانا مرحوم کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عنایت کرے، آمین!

گذشتہ اگست کے مہینے میں مولانا جلال الدین رومی سے متعلق ایران سوسائٹی کلکتہ میں منعقدہ کانفرنس کے موقع پر ان کی تشریف آوری ہوئی تھی جس میں انہوں نے اپنا بہت ہی پرمغز اور معلومات افزا مقالہ نذر سامعین کیا تھا، وہ مقالہ "معارف" میں شائع بھی ہوا، حادثۂ جانکاہ

سے چند ہفتے قبل ان سے فون پر میری گفتگو ہوئی، دسمبر کے ''معارف'' میں غالب کے فارسی قطعات سے متعلق میرا ایک مضمون شائع ہوا، اس پر میں نے انہیں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے معارف کا وہ شمارہ ارسال کرنے کی درخواست کی، اس کے علاوہ دو سال سے زائد کا عرصہ ہوا میں نے اپنی کتاب بہ عنوان ''عاقل خان رازی - احوال و آثار'' معارف میں تبصرہ کے لیے بھیجی تھی، اس جانب بھی ان کی توجہ میں نے دلائی تو اظہار تاسف کرنے لگے، ستمبر کے معارف میں روی کانفرنس کی رپورٹ بھی انہوں نے شائع کی اور ڈاکٹر محمد منصور عالم، خواجہ جاوید یوسف اور خاکسار کی معمولی خدمات اور مہمان نوازی کو انہوں نے بہت سراہا، پھر ۱۳؍ ستمبر کا روانہ کردہ ایک پوسٹ کارڈ خاکسار کے نام ان کی جانب سے موصول ہوا جس میں ان کی خورد نوازی کا تذکرہ ہے، کسے معلوم کہ ان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات ہوگی، قدرت کو بھی کیا منظور ہے کہ سید صباح الدین کی طرح ان کی موت بھی کسی حادثے کا شکار ہوگی، آہ متاع دین و دانش درویش صفت انسان ہمیں داغ فرقت دے گیا، جن کے علم و آگہی سے ہمیں جلا ملتی تھی، مولانا مرحوم بہت ہی خلیق النفس، منکسر المزاج اور نرم گفتار تھے، صباح الدین صاحب کے بعد دارالمصنفین کی وہ آبرو تھے، ''معارف'' کی روایت اور معیار برقرار رکھنے کی انہوں نے حتی الامکان کوشش کی، توقع ہے کہ اسی آب و تاب کے ساتھ معارف پابندی سے علمی افق پر جلوہ گر ہوتا رہے گا۔

ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں دارالمصنفین اور اس کے رفقا کے ساتھ ہیں۔

خیر اندیش
محمد امین عامر

مجمع الفقہ الاسلامی (الہند)
جامعہ نگر، نئی دہلی
۴؍ ۲؍ ۰۸ء

مکرمی و محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے انتقال کی خبر سے فقہ اکیڈمی کے ذمہ داران و

کارکنان اور وابستگان کو سخت صدمہ و ملال ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں بلند درجات سے نوازے، انہوں نے آخر دم تک دبستان شبلی کی خدمت انجام دی اور دارالمصنفین کا نام روشن کیا اور علم و ادب کا چراغ جلائے رکھا۔

وہ ہمارے یہاں فقہی سمینار میں بھی شریک رہے، اکیڈمی کی کوششوں کو سراہتے رہے اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ان کے انتقال سے مدرسۃ الاصلاح، دارالمصنفین ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام علمی و فکری انجمنوں کا بڑا علمی نقصان ہوا اور ایک خلا پیدا ہوا جس کی شدت کا احساس جانے والے کی خوبیوں اور مکارم اور اعلا خدمات سے لگایا جاسکتا ہے۔

دعائے خیر میں یاد رکھیں۔

امین عثمانی

باسمہ سبحانہ

جامعہ عربیہ عین الاسلام
نوادہ مبارک پور، اعظم گڈھ
۲۸؍ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ

مکرمی و محترمی! زیدت حسناتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں، حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے سانحۂ ارتحال سے سخت دلی صدمہ پہنچا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات عالیہ کا بہترین بدلہ مرحمت فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

موصوف کے ایصال ثواب کے لیے جامعہ میں قرآن خوانی اور دعائے مغفرت کرادی گئی ہے اور جلسہ تعزیت بھی منعقد کیا گیا جس میں موصوف کی خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا۔

مہربانی فرما کر مرحوم کے جملہ صاحب زادگان و دیگر اہل خانہ تک میری طرف سے تعزیت مسنونہ پیش کردیں۔

والسلام
جمیل احمد نذیری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

القرآن انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ
۳/ فروری ۲۰۰۸ء

بہ خدمت گرامی محترم عمیر الصدیق صاحب
رفیق دار المصنفین، شبلی منزل
اعظم گڈھ

مکرمی!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں، محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کے حادثۂ جانکاہ کی اطلاع سے ہم سب لوگ حد درجہ غمگین ہیں، ان کی صورت نظروں کے سامنے ہے، ان کی محبت، تواضع، انکساری اور ان کی سادگی کے مناظر یاد آرہے ہیں، ان کے فکر و نظر کی گہرائی اور بصیرت افروز تحریریں اور بہت کچھ چیزیں سب قطار در قطار گھوم رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے آپ تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، ہم لوگوں کو ان کے لائق تقلید خوبیوں کو باقی رکھنے اور نئی نسل تک منتقل کرنے کی توفیق ملے اور دار المصنفین کے لیے نعم البدل کی سبیل پیدا ہو۔

والسلام
ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی (ڈائرکٹر)

۵/ فروری ۲۰۰۸ء
کوچہ فرنگن،
رام پور یوپی

محترمی ایڈیٹر صاحب!
السلام علیکم

اخبارات کے ذریعے جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے حادثۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے، مرحوم قابلیت اور نیکی کا مجسمہ تھے اور مجھ ناچیز پر شفقت فرماتے تھے، رام پور کے ایک سمینار میں بالمشافہ ملاقات سے سرفراز ہو چکا ہوں، ان کی محبتوں کو کبھی بھلا نہ سکوں گا۔

عتیق جیلانی سالک

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

بسم اللہ

زاہدہ منزل،
4/873 نیو فرینڈس کالونی
علی گڑھ

محترمی!
السلام علیکم

محب گرامی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کے انتقال پر ملال پر دلی تعزیت آنجناب اور ارکان دار المصنفین و شبلی کالج کی خدمت میں پیش ہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے، خاکسار پر بڑی عنایت فرماتے تھے، خاص کر اس بنا پر کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم میرے حقیقی چچا اور خسر تھے جن کا شمار دار المصنفین کے قدیم ترین ارکان میں تھا اور جو بساط شبلی کے بڑے نام ور حاشیہ نشینوں میں تھے، چنانچہ آپ کے علم میں ہوگا کہ وہ اپنی وفات تک دار المصنفین کے ورکنگ پریسیڈنٹ رہے۔

میں گورنمنٹ آف انڈیا کی اکنامکس سروس سے ریٹائر ہو کر کئی سال سے اپنے لڑکے ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی پروفیسر شعبہ انگریزی کے پاس مقیم ہوں جو اسٹاف اکیڈمک کالج کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔

بڑی خوشی ہوئی کہ دار المصنفین کی سربراہی آنجناب کے سپرد ہوئی ہے، دعا ہے کہ یہ ملی و قومی ادارہ آپ کے عہد میں ہر طرح کی ترقی کرے اور علم و ادب کی قیمتی خدمات انجام دے جس کے لیے یہ ادارہ عالم شہرت رکھتا ہے۔

مولانا اصلاحی مرحوم سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی اور ندوۃ العلما کے جلسہ انتظامیہ میں شرف ملاقات بھی حاصل ہوتا تھا۔

پچھلی ملاقات میں مرحوم سے دو باتوں کے بارہ میں گفتگو ہوئی تھی اور خیال تھا کہ اس سال ندوہ کے جلسہ میں زبانی کچھ طے بھی ہو جائے گا، آپ کی اطلاع کے لیے لکھتا ہوں:

۱- مولانا مرحوم نے فرمایا کہ دارالمصنفین کی لائبریری میں مولانا دریابادی کے ہفتہ وار ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' کی مکمل فائلیں موجود نہیں ہیں، میں نے عرض کیا کہ میرے پاس تینوں اخبارات کا مکمل سیٹ علی گڑھ میں موجود ہے جو پرچے اعظم گڑھ میں نہ ہوں، ان کی نشان دہی کردی جائے تو ان کی فوٹو کاپی کرواکے میں حاضر کرسکتا ہوں۔

۲- وہ مولانا دریابادی کی کوئی کتاب دارالمصنفین کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے، اب میں عرض کیا کہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے، دارالمصنفین کا حق سب سے مقدم ہے جو کتاب بھی چاہیں بہ مسرت تمام شائع فرماسکتے ہیں، فی الحال یہ کتابیں نایاب ہیں۔

۱-تصوف اسلام، ۲-فیہ مافیہ، ۳-ہم آپ، ۴-اعلام القرآن، ۵-زود پشیمان۔

دارالمصنفین سے ہم لوگوں کو بڑی انسیت اور خصوصی عزیزانہ تعلق ہے، اسی بنا پر یہ عریضہ ارسال ہے، امید ہے کارلائقہ سے ضرور یاد فرمائیں گے، میرے ایک ہم وطن عزیز حافظ عمیر الصدیق صاحب دارالمصنفین ہی میں کچھ عرصہ سے ہیں۔

والسلام

عبدالعلیم قدوائی

تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں

از:- ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان کے مسلم دور خصوصاً عہد سلطنت کی علمی وثقافتی تاریخ مصنف کی دل چسپی کا خاص موضوع ہے اور اس پر اردو اور انگریزی میں ان کی کئی کتابیں شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے مسلم دور حکومت کی تعلیمی سرگرمیوں کا حال اور اس کی نمایاں خصوصیات دکھائی ہیں، یہ پانچ ابواب میں ہے، پہلے باب میں عہد سلطنت کے مدارس کا جائزہ لے کر ان کی نوعیت اور خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں مسلم دور حکومت میں اعلا مرحلے کی تعلیم میں اختیار کیے جانے والے وسائل وذرائع کا ذکر ہے اور تیسرے میں اس عہد کی درسیات میں جزونصاب کتابوں کا تذکرہ ہے، آخر کے دو ابواب میں ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں عورتوں کی تعلیم کا حال اور مدارس کے قیام اور علم کی توسیع واشاعت میں خواتین کی مساعی دکھائی گئی ہیں، مسلم دور کی تاریخ کے طلبہ محققین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ قیمت: ۱۰۰/روپے

آثار علمیہ وتاریخیہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اہل علم کے خطوط (۴)

(۱)

باسمہ تعالیٰ شانہ

43/1,10th Commercial street
Defence Housing Athourity
Phase IV, Karachi 75500

مکرم ومحترمی جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حفظہ اللہ ومعنا بہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ بایں پیرانہ سالی بہ صحت وعافیت ہوں، تین سال قبل جب آپ کراچی تشریف لائے تھے تو یہاں آپ سے پیرس کی اولین ملاقات کے بتیس سال بعد دوسری ملاقات ہوئی تھی، آپ سے چند امور استفسار طلب ہیں:

۱- عام مفسرین ومحدثین کے اقوال کے مطابق بخاری وغیرہ کی حدیث پر اعتماد کرتے ہوئے آپ نے بھی یہی تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کریم جنگ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں عُسُب، ولخاف ورقاع وغیرہ سے جمع کیا گیا، ان تمام احادیث کا راوی حضرت زید بن ثابت سے عبید بن السباق ہے اور وہ تنہا زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عبید السباق سے تنہا زہری روایت کرتے ہیں، مگر مرحوم تمنا عمادی نے جو کتاب جمع قرآن لکھی ہے اس میں مستند حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ عبید بن السباق کی ولادت سے ۸ یا ۵ سال قبل زید ابن ثابت وفات پاچکے تھے، اس لیے ان کے نزدیک یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، آپ کے علم میں ہوگا کہ ان کے نزدیک قرآن کریم حضورؐ کے زمانے میں سارے کا سارا لکھا ہوا موجود تھا، میں نے پڑھا ہے کہ مولانا مناظر گیلانی صاحب کا بھی یہی خیال تھا جو انہوں نے تدوین القرآن میں لکھا ہے، یہ کتاب اب دست یاب نہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۱- پھر یہ کہ عربوں کے پاس اتارق الغزال تھا کہ القصائد السبع المعلقات کو لکھ کر کعبے کے اندر لٹکا دیں، حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس عربی کی توراۃ بھی لکھی ہوئی تھی، اس طرح زید ابن عمرو بن نفیل نے توراۃ پڑھ رکھی تھی، پھر قرآن کے لیے رقاع یا قراطیس کا ہونا قابل تعجب ہے، حضرت عمر نے اپنی بہن فاطمہ کے پاس لکھی ہوئی سورۂ طہ پڑھی تھی "الصادقۃ" بھی عبداللہ ابن عمرو بن عاص نے رقاع یا قراطیس پر لکھا تھا، پھر قرآن ہی کے لیے یہ رقاع (جلد الغزال) یا قراطیس کیوں مہیا نہ تھے؟

۲- سورۂ بینہ کی آیت رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن صحف میں لکھا ہوا موجود تھا "کتب" ابواب یا سور کے معنی میں ہے، بخاری میں بھی کتب ہیں۔

۳- خطیب بغدادی کی کتاب تقیید العلم میں مذکور ہے کہ حضرت انس، حضرت ابی سعید الخدری، حضرت عبداللہ بن عباس رسول اللہؐ سے سنی ہوئی احادیث و آیات لکھا کرتے تھے۔

۴- صحیح بخاری کی کتاب الوضوء و کتاب الغسل و کتاب النکاح میں جو احادیث مذکور ہیں، ان میں اونٹ کے پیشاب کا پاک ہونا، ابوموسیٰ اشعری کا "مرابض الغنم" میں نماز پڑھنا اور یہ کہنا کہ ھی والبریۃ سواء اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت عائشہ کی حدیث میں ان کا حضورؐ کے سر پر "طیب" لگانا اور اسی رات آپ کا گیارہ بیویوں سے مباشرت کرنا اور پھر ایک غسل کرنا اور صبح کو محرم ہونا اس حالت میں کہ آپ کے سر پر "طیب" یا اس کے آثار کا موجود ہونا یا پھر ازواج مطہرات کے ذکر میں آنحضرتؐ کا اپنے الجون کو تقبل کرنا یا پھر آنحضرتؐ کا اور حضرت عائشہ کا ایک لگن سے ساتھ ساتھ نہانا، یہ سب باتیں کہاں تک صحیح ہوسکتی ہیں، دوسری احادیث الحیاء شعبۃ من الایمان، النظافۃ من الایمان وغیرہ سے ان کا تعارض ہے اور پھر ایک رات یا ایک ساعت میں ۹ ازواج کے ساتھ مباشرت اور ۳۰ افراد کی قوت جماع تو بہت عجیب اور شان نبوت کے خلاف باتیں لگتی ہیں، کتنا وقت درکار ہے اور آپ نے تہجد کب پڑھی ہوگی؟ آپ کی ان سب کے بارے میں کیا تحقیق ہے؟ فتح الباری سے کوئی تسکین نہیں ہوتی وہ تو یعنی ابن حجر بس "سند" کے قیدی ہیں۔

۳- اجزائے قرآن عرب ممالک، ترکی، ایران، تونس میں چھپے ہوئے سب یکساں ہیں لیکن پاک و ہند کے مصاحف میں چھ پاروں میں یہ "تجزیہ" مختلف ہے، ان مصاحف میں ساتواں پارہ واذا سمعوا کے بجائے لتجدن اشد الناس سے، گیارہواں پارہ یعتذرون کے بجائے آیت انما السبیل سے، چودہواں پارہ سورۂ حجر کی دوسری آیت ربما یود الذین کے بجائے الرٰ سے، بیسواں پارہ امن خلق کے بجائے فما کان جواب قومہ سے، اکیسواں پارہ اتل ما اوحی کے بجائے ولا تجادلوا اهل الکتاب اور تیئسواں پارہ ومالی لا اعبد کے بجائے وما انزلنا علی قومہ سے شروع ہوتے ہیں، یہ اختلاف برصغیر کے مصاحف میں کیسے اور کب رونما ہوا؟

۴- کیا ابوالحسن علی المدائنی کی کچھ کتابیں خاص طور پر فتوح السند وغیرہ کہیں قلمی پائی جاتی ہیں؟

۵- حیدرآباد دکن سے شائع شدہ ایک رسالے مطبوعہ ۱۹۹۱ء سے معلوم ہوا کہ استنبول میں صحیفہ ہمام بن منبہ کے ایک تازہ نسخہ کے ساتھ اس مجموعہ میں صحابہ کرام کے کچھ اور مجامع حدیث بھی ملے ہیں، وہ کیا ہیں، کوئی طبع ہوا؟

میں نے آپ سے بہت سے سوالات پوچھ لیے ہیں، اس زحمت دہانی پر معذرت خواہ ہوں لیکن آپ سے امید ہے کہ مفصل جوابات سے مستفید فرمائیں گے، بینوا و توجروا۔

والسلام مع الاحترام ودعاء طول العمر مع الصحۃ

المخلص

سید رضوان علی ندوی

(۲)

الرقوم ۲۰ر جولائی ۱۹۹۰ء

عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد　اہم استفسار

استاد محترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مدظلہ

السلام علیکم

خادم آپ کے ایک قدیم ترین شاگرد "جناب وحید اللہ خاں صاحب مرحوم"

پروفیسر شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ کا بڑا لڑکا ہے، میرے والد مرحوم کو آپ سے اتنی عقیدت تھی کہ آپ کے یہاں سے ہجرت کر جانے پر میرے چھوٹے بھائی کا نام حمید اللہ خاں رکھا، میں آپ کی تحقیق وتصانیف سے فائدہ اٹھا کر یہاں مختلف اسلامی عنوانات پر تقریر وتحریر پیش کرنا اپنا ادبی فرض اور حق سمجھتا ہوں، مجھے حسب ذیل اہم ترین امور میں آپ کی رہنمائی درکار ہے:

۱- آپ نے خطبات بہاول پور میں تاریخ قرآن پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ رسول اکرمؐ نے آخری رمضان شریف میں اللہ کے حکم اور جبریلؑ کی ایما پر پورا قرآن دو مرتبہ تلاوت فرمایا، تاکہ تمام تحریری نسخہ اور حفاظ کے حافظہ کی تصدیق وتصحیح ہو جائے جس کو ''عرضہ'' یا پیش کش کہتے ہیں، خادم کو یہ امر سمجھنا ہے کہ سورۃ المائدہ کی آیت ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ ......'' یعنی آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا...... (۵:۳) توجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ ہجری میں نازل ہوئی جو رمضان کے دو ماہ بعد کا واقعہ ہے، حضرت عمرؓ سے روایت بھی ملتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم میدان عرفات میں تھے، جب یہ آیت آخری رمضان سے دو ماہ بعد نازل ہوئی تو دو ماہ قبل کے رمضان میں پورا قرآن کس طرح رسول کریمؐ تلاوت کر سکتے تھے؟ مجھے آپ کی معلومات پہ ایمان کی حد تک یقین ہے اور میں حیدر آباد میں آپ کی تحقیقات کو عام کرنے کا کام انجام دے رہا ہوں جو میرا املی فریضہ ہے، بہ راہ کرم شک رفع فرما کر احسان فرمائیں۔

۲- ''عذاب قبر'' کے تعلق سے جتنے بھی قرآنی احکام اور احادیث ملتی ہیں اس میں دراصل عذاب قبر سے مجازاً مراد ''عذاب برزخ'' ہے جو موت سے لے کر یوم آخرت صور پھونکے جانے تک کا عرصہ ہے جس میں نیک کو جزا اور بدکار کو سزا جاری رہتی ہے، سورۃ المومنون کی آیت نمبر ۱۰۰ میں بھی برزخ کا ذکر ہے، عذاب قبر سے مراد ''مدفن'' یا ''لحد'' کا عذاب نہیں ہے ورنہ وہ انسان جو جلائے جاتے ہیں یا غرق ہو جاتے ہیں کیا وہ عذاب قبر سے فرار رہیں گے، ''عذاب قبر'' سے مراد صرف عذاب برزخ سمجھنا کیا صحیح ہے؟ تصدیق فرمائیں تاکہ شک دور ہو۔

۳- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' کی تفسیر اور بیان پر بعض لوگ معترض ہوتے ہیں، مجھے تو مولانا مودودی کی تفسیر وبحث عقل انسانی کی کسوٹی پر مناسب معلوم ہوتی ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا تفہیم القرآن میں دی گئی مولانا مودودی کی رائے قابل قبول ہے، کیا ترجمان القرآن میں ابوالکلام آزاد یا پاکستان کے مفسر غلام احمد پرویز کی تفسیر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، یا آپ مجھے کسی اور تفسیر کے پڑھنے کا مشورہ دیں گے؟

حسب بالا امور میں آپ کی فوراً رہنمائی کا محتاج ہوں، امید کہ آپ مایوس نہ فرمائیں گے، میرے والد مرحوم مولوی وحید اللہ خاں صاحب نے ساری زندگی آپ کے تعلق سے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ آپ کا احترام ہمارے دلوں میں ہمیشہ رہے گا، میں آپ کے ایک رشتہ دار جناب کمال صاحب جن کی لائبریری کٹل منڈی میں واقع ہے ملاقات کی ہے اور ان کے ذریعہ آپ کی تصانیف خریدتا رہتا ہوں، آج صبح ہی انہوں نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی اور آپ کا پتہ ارسال فرمایا، تاکہ میں حسب بالا ضروری رہنمائی حاصل کر سکوں، خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ جیسے جید عالم دین کو اسلام اور ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے لیے ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے، آمین ثم آمین۔

آپ کے جواب کا حسب ذیل پتہ پر انتظار رہے گا، شکریہ، صرف گھر کے اس پتہ پر جواب مرحمت فرمائیں۔

خادم احمد اللہ خاں

پتہ مراسلت: ذاکر احمد اللہ خاں
مکان نمبر ۲۵ / ۵۶۳-۳-۶
سوماجی گوڑہ، حیدر آباد،
آندھرا پردیش ۵۰۰۴۸۲، انڈیا

(۳)

۷ رشعبان المعظم ۱۴۰۳ھ
34 Warren street, Savile Town
DEWSBURY, West Yorkshire
U.K.

بہ گرامی خدمت محترم جناب ڈاکٹر صاحب، زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، احقر کا جناب سے تعارف بہت پرانا ہے اور گاہے گاہے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے ہمارا تعارف ''فاران'' کی برطانیہ سے اشاعت

کے وقت سے ہے، احقر نے نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں بالخصوص صبح صادق کے ابتدائی وقت کے بارے میں ایک ادنی سعی و کوشش کی ہے جو بنام "برطانیہ میں صبح صادق کا صحیح وقت" پیش خدمت ہے، یہ ضرورت کیوں پیش آئی وہ عرض مولف پڑھنے پر سامنے آجائے گی۔

جناب والا سے دو گزارش ہے، ایک یہ کہ کتاب پر پڑھ کر اپنی رائے عالی سے نوازیں یا کم از کم اس کی قبولیت کے لیے دعا سے نوازیں۔

دوسری ضروری اہم گزارش یہ ہے کہ جناب نے فاران میں اوقات کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا اس میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ دنیا کو دو حصوں میں معتدل و غیر معتدل میں تقسیم کیا جائے، اول میں نمازوں کے اوقات، طلوع و غروب پر متعین ہوں اور غیر معتدل منطقہ میں بجائے طلوع غروب کے گھڑیوں کے حساب سے اوقات نماز متعین ہوں اور جناب نے اس میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ بہت زمانہ ہوا حیدرآباد میں علما کا ایک اجتماع اس بارے میں ہوا تھا جس میں انہوں نے ۴۵ عرض البلد کو حد فاصل قرار دیا تھا الخ۔

میری جناب سے گزارش ہے کہ جناب میری اس بارے میں رہنمائی فرمائیں کہ اگر اس فیصلہ کی کاپی یا اس کی نقل جناب کے پاس ہو یا مہیا ہو سکتی ہو تو اس بارے میں مدد فرمائیں، اسی طرح ان علماء میں سے جو بہ قید حیات ہوں ان کے پتے ہوں تو اس سے آگاہ فرما دیں، نیز جس جگہ یہ اجتماع ہوا، اس بارے میں جو معلومات ہوں وہ مجھے پہنچا دیں، عنایت و مہربانی ہوگی، بندہ کو اس میں خاصی دل چسپی ہے میں امید کرتا ہوں کہ جناب کی خدمت میں احقر کی یہ چند سطری معروضات رائے گاں نہ جائے گی بلکہ اپنے چھوٹوں پر شفقت کے پیش نظر ان کی حوصلہ افزائی میں اضافہ کے خاطر ضرور جواب سے نوازیں گے، جناب کے ڈاک کے پتہ سے بھی نوازیں، دعاؤں کی درخواست بالخصوص ماہ مبارک میں۔

احقر

یعقوب اسماعیل منشی

مطبوعات جدیدہ

کتب سابقہ میں سید المرسلینؐ سے متعلق بشارتیں: از: ڈاکٹر مقصود احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۳۳، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ادارۂ توازن، ۲۵۴-نیا پورہ، مالیگاؤں اور ڈاکٹر مقصود احمد، ۲۰۳، شفا کامپلکس، تاندل جا روڈ، بڑودہ گجرات۔

دنیا کی ان مذہبی کتابوں میں جن کا تقدس ان کے ماننے والوں کے دلوں میں ہے، مسخ و انحراف اور ان کی تاریخی حیثیت میں شبہات کے باوجود ان کے مضامین میں کسی درجہ نبی آخر الزماںؐ کی آمد کا ذکر کسی نہ کسی پیرایے میں ملتا ہے، ویدوں کے اس قسم کے بعض مضامین کی نشان دہی کی جاتی رہی ہے اور توراۃ، زبور اور انجیل میں مبشرات کا ذکر عام ہے، ابو الانبیا حضرت ابراہیمؑ کی دعائے خلیل اور نوید مسیحا کا ذکر تو تواتر کے ساتھ ہے، اس مفید کتاب میں اسی اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ اس میں ایک باب میں عہد نامہ قدیم کے پاروں یعنی کتب پیدائش، استثنا، زبور، غزل الغزلات، یسعیاہ، یرمیاہ، دانیال، حبقوق، حجی اور ملا میں موجود بشارتوں کا احاطہ کیا گیا ہے، دوسرے باب میں انجیل برناباس اور تیسرے باب میں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی بشارتوں کو تلاش کر کے منظم اور مربوط شکل میں پیش کیا گیا ہے، یہ کاوش سیرت نبویؐ کے باب میں بجائے خود لائق تبریک ہے لیکن اس کا اصل مقصد بھی قابل تعریف ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی تعلیمات و ارشادات کی صحیح تصویر کشی کر کے مسلمانوں اور اہل کتاب میں کم از کم ایک کلمہ متفقہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کرنا ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے مطالعہ کی بنیاد علمائے حق کی کتابوں اور ان کے افکار پر رکھی گئی ہے، کتاب محنت اور اچھے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے، پر از معلومات اور دل چسپ ہے، ایک جگہ مولانا عنایت رسول چریا کوٹی کی عبارت ہے لیکن حوالے کے بغیر، یہ شاید کسی ثانوی ماخذ سے نقل کیا گیا ہے کیوں کہ ان کی مشہور اور اس باب میں نہایت اہم کتاب "بشریٰ" کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

چند ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء: از: مولانا یٰسین اختر مصباحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۶۰ روپے، پتہ: دار القلم ۹۲ / ۶۶، قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر اوکھلا، نئی دہلی۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی داستان دوسری اور داستانوں کے برخلاف، موجودہ ہندوستان کے لیے عبرت اور نصیحت کا بڑا سرمایہ رکھتی ہے، ہندوستان کی سینکڑوں سال کی تاریخ میں اس تحریک کو بجا طور پر پہلی قومی تحریک کہا جاتا ہے، ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد بھی برطانیہ اور مغربی استعماریوں کے مکر و فریب اور ظلم و جور، مال و اقتدار کی ہوس کی تلخ یادوں کو زندہ کرنے اور رکھنے کا جواز بھی ہے کہ آج بھی مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور اقوام عالم کی تاخت و تاراج اور ان کے معاشی اور اقتصادی استحصال کی ہوس اور نیت میں کچھ فرق نہیں آیا، امریکہ کی قیادت میں آج بھی استعماری طاقتیں اسی طرح سرگرم عمل ہیں، ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد حکومت اور مختلف طبقات کی جانب سے سمیناروں کا انعقاد اور کتابوں اور رسالوں کی اشاعت ۱۸۵۷ء کی اہمیت کا اقرار ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کا ایک حصہ ہے اور یہ اس لیے اہم ہے کہ استعمار کی صدا آج بھی اسی طرح بلکہ شاید زیادہ شد و مد سے گونج رہی ہے کہ مسلمانوں کو عالمی پیمانے پر اور ہندو مسلم اتحاد کو ملکی پیمانے پر نشانہ بنایا جائے، ایسے مکروہ عزائم اور اعمال کی فضا میں ان مجاہدین آزادی خصوصاً علمائے وقت کی جد و جہد، ایثار و قربانی اور قید و بند کے شدائد کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، اس کتاب میں مفتی صدر الدین آزردہ، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا سید احمد شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے مشہور علما کے ذکر کے ساتھ مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی مراد آبادی، مولانا وہاج الدین مراد آبادی اور مولانا رضا علی خاں جیسے نسبۃً کم معروف علمائے جنگ آزادی کا تذکرہ بھی ہے جس سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے، یہ وہ علما ہیں جنہوں نے مسلمان اور ہندوستانی دونوں حیثیتوں کی ایمان داری سے نمائندگی کی، اس کتاب کے مولف سنجیدہ اور متوازن اور مستند مطالعہ و تحقیق کے لیے معروف ہیں، یہ کتاب بھی ان کے اعتدال اور شرافت اسلوب کا نمونہ ہے، شروع میں انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت و حکومت پر جامع تبصرہ کیا ہے اور اس

سے بھی زیادہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے متعلق ایک انگریز آفیسر ایڈورڈ ٹامسن کی اہم کتاب ”دی اور سائڈ آف میڈل“ کے اردو ترجمے تصویر کا دوسرا رخ کے بعض معلومات کو بھی پیش کر دیا ہے، یہ کتاب شہادت اعداء کا درجہ رکھتی ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کے ایک ہندی ترجمے کی اشاعت ہونے جا رہی ہے، ۱۸۵۷ء میں علمائے اسلام کی قربانیوں سے واقف ہونے کے لیے اس کتاب کی افادیت ظاہر ہے۔

مسلمانوں کی تعلیم ایک جائزہ: از: جناب اخلاق احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۵۴، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ اور البلاغ پبلی کیشنز، N - 1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

دینی اور مسلمان بچوں کی تعلیم اور سرسید کے تعلیمی افکار کی معنویت کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ اس مختصر لیکن بے حد مفید کتاب میں مستشرقین اور اسلامیات کے متعلق بھی ایک اہم مضمون ہے، مصنف کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ مسلمانوں کی تعلیم پر مغربی اثرات کے عنوان سے ہے اور ان کے ایک مضمون کا عربی ترجمہ بھی دیا گیا ہے، فاضل مصنف مسلم یونی ورسٹی کے قابل فخر فرزند ہیں، نمائش و خود ستائی کے ماحول میں بھی وہ ہوس نام و نمود سے بیزار رہے لیکن ان کے قلم کے خاص انداز کو شناخت ملی، ان کا سادہ اور بے تکلف اسلوب ان کی بڑی خصوصیت ہے، انہوں نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ایک زمانہ ہوا، پروفیسر مقبول احمد کی نگرانی میں لکھا تھا اور اس کا موضوع بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی روایتی تعلیم کے متعلق تھا، ان کا خیال ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی منزلوں میں زوال کا تیشہ سب سے پہلے علم کے شیشے کو چور کرتا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت پر زوال آیا تو سب سے پہلے زد، ان کے علم و تعلیم پر پڑی، انہوں نے اس کی حفاظت کی کوشش میں دریغ نہیں کیا لیکن یہ کوشش حفاظت تک ہی محدود رہی، مصنف کے درد کی تفسیر یہ ہے کہ طرز کہن پر اصرار کرنا اور آئین نو سے اعراض کرنا درست نہیں، کتاب کا ہر مضمون اسی اجمال کی شرح ہے اور جس دردمندی سے لکھا گیا ہے پڑھنے والے پر اس کا اثر بھی ہوتا ہے، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجموعہ مضامین واقعی

بہت مفید ہے، پیش لفظ میں جناب محمد قاسم صدیقی کا یہ قول مکمل صداقت ہے کہ مصنف کی یہ تحریریں غور وفکر کے در، وا کرتی ہیں، وسیع فکر، عمیق مشاہدے اور طویل مطالعے نے ان کے مقصد کو بامعنی بنادیا ہے۔

شہر سخن: از: ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۷۶، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: ماہنامہ امکان، سیمانت نگر، کنچن بہاری مارگ، لکھنؤ اور دوسرے مکتبے۔

قریب چھبیس شاعروں کے حالات ایک ڈائری کی شکل میں آج سے چالیس برس پہلے شائع ہوئے تو نثر میں شاعری کا لطف محسوس کیا گیا، ہمارے سامنے اسی شہر سخن کی رونق ایک بار پھر نئے رنگ و پیرہن میں ہے، سلام مچھلی شہری سے جگر مرادآبادی تک جتنے بھی شاعر اس بزم میں ہیں، فاضل مولف کو ان کی قربت حاصل رہی، قربت کے ان لمحات کی تازگی آج بھی برقرار ہے، طبع جدید کا مقصد بھی یہی ہے کہ ملک کی آزادی کے فوراً بعد کے وہ سخن ور جن سے نگارخانہ سخن، منور تھا اور جن کی تابناکیاں اب مہ وسال کی گردش سے دھندلی ہوتی جاتی ہیں، ان کی شخصیت اور شاعری کی کرنیں، نئی نسل کے نہاں خانوں کو نئی روشنی بخش سکیں، مصنف کا اسلوب اس درجہ بے ساختہ اور دل کش ہے کہ ہر سطر بلکہ ہر لفظ وحرف پرکشش بن گیا ہے، ان کے چھوٹے چھوٹے جملے بسا اوقات بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں، مثلاً سلام مچھلی شہریت کے ہیئتی تجربات کے متعلق یہ کہنا کہ وہ شمع راہ منزل ہیں یا لوح تربت، مستقبل کا مورخ ہی فیصلہ کرسکتا ہے، ہر شاعر کے لیے کوئی نہ کوئی رائے ظاہر کی گئی ہے، چالیس سال کے بعد ان میں سے بعض اب بھی جوں کی توں ہیں لیکن کچھ خیالات ایسے بھی ہیں جن کی واقعیت میں تغیر آیا ہے، طبع ثانی میں کسی قدر محنت کی ضرورت اسی نقطہ نظر سے محسوس ہوتی ہے، خلیل الرحمان اعظمی کے ذکر میں کتابت کی غلطی نے یہ جملہ لکھ دیا کہ ”ان کے اشعار اکثر وبیشتر ہمیں معتقدین کی یاد دلاتے ہیں“، متقدمین کی روح سے اس کے لیے معذرت ضروری ہے۔

ع۔ص

سلسلہ تاریخ اسلام و قرآنیات و اہم عصری مسائل

		Pages	Rs
۱۔ تاریخ اسلام اول (عہد رسالت)	شاہ معین الدین احمد ندوی	346	90/-
۲۔ تاریخ اسلام دوم (بنوامیہ)	شاہ معین الدین احمد ندوی	370	90/-
۳۔ تاریخ اسلام سوم (بنوعباس)	شاہ معین الدین احمد ندوی	472	115/-
۴۔ تاریخ اسلام چہارم (بنوعباس)	شاہ معین الدین احمد ندوی	464	140/-
۵۔ تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	510	110/-
۶۔ تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	480	105/-
۷۔ تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندوی	550	90/-
۸۔ تاریخ صقلیہ دوم	سید ریاست علی ندوی	480	80/-
۹۔ تاریخ اندلس اول (مجلد)	سید ریاست علی ندوی	336	110/-
۱۰۔ ہماری بادشاہی	عبدالسلام قدوائی ندوی	192	40/-
۱۱۔ صلیبی جنگ	سید صباح الدین عبدالرحمن	46	15/-
۱۲۔ بہادر خواتین اسلام	مولانا سید سلیمان ندویؒ	57	25/-
۱۳۔ اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	352	65/-

قرآنیات

		Pages	Rs
۱۔ تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	454	130/-
۲۔ تعلیم القرآن	محمد اویس نگرامی ندوی	156	25/-
۳۔ جمع تدوین قرآن	سید صدیق حسن (آئی سی ایس)	90	30/-

اہم عصری مسائل

		Pages	Rs
۱۔ بابری مسجد	ادارہ	172	30/-
۲۔ مطلقہ عورت اور نان ونفقہ	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی	92	20/-